بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

"فدک" خیبر کے نزدیک ایک نہایت زرخیز قریہ کا نام ہے جو مدینہ سے تقریباً ۱۴۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع تھا۔ فدک کے باغات نہایت پُرثمر اور بے حساب دولت وثروت کے حصول کا ذریعہ تھے۔ ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کا اندازہ ان دو تاریخی شواہد سے لگایا جاسکتا ہے :

(۱) خلیفۂ اوّل کے بقول پیغمبرؐ، فدک کی آمدنی سے جنگی اخراجات پورے کرتے تھے۔

(۲) جب فدک معاویہ کے ہاتھ لگا تو اس نے اسے تین ایسی سربرآوردہ شخصیات میں تقسیم کردیا جن کا مرتبہ اس زمانے میں خلیفہ کے بعد سب سے بڑا تھا یعنی "مروان ابن حکم" ۔ "عمر ابن عثمان" اور ـــــــ "یزید ابن معاویہ"

فدک ۷ھ تک یہود کی ملکیت تھا لیکن اس کے بعد رحمِ اسلامی

قرار پایا ۔ فدک کے ارضِ اسلامی قرار پانے کی تفصیل یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے مدینہ میں حکومت اسلامی کی تشکیل کے فوراً بعد اس نوخیز اسلامی مملکت کے استحکام اور اسے دشمنوں کی فتنہ انگیزیوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر مدینہ اور اس کے قرب و جوار میں رہائش پذیر یہودیوں اور غیر مسلم قبائل سے ایک معاہدہ کیا جس کے خاص نکات یہ تھے کہ :

(۱) ——— اس معاہدہ میں شریک فریقین آپس میں جنگ نہیں کریں گے۔

(۲) ——— اگر اس معاہدہ میں شریک کسی فریق پر جنگ مسلط کی جائے گی تو دوسرے تمام فریق اس کا دفاع کریں گے۔

فتح خیبر کے بعد پیغمبر اسلام کو خبر ملی کہ فدک کے یہودی آپ سے کیے گئے معاہدہ کی خلاف ورزی پر آمادہ ہو چکے ہیں اور انھوں نے دوسرے مشرکین عرب کے ساتھ مل کر اتحاد قائم کر لیا ہے جو کسی وقت بھی مسلمانوں پر حملہ آور ہو سکتے ہیں ۔

پیغمبر اسلامؐ نے اس اطلاع کے ملتے ہی مدینہ کی حفاظت اور انقلابِ اسلامی کے استحکام کی خاطر فدک کے یہودیوں سے کیے گئے معاہدہ کو توڑنے اور ان سے جنگ کا اعلان کیا ۔

جوں ہی یہود کو پیغمبرؐ کے اس ارادے کا علم ہوا تو اس رعب و دبدبہ اور ہیبت و جلالت کی بنا پر جو مسلمانوں کی طرف سے ان کے دلوں پر طاری تھی انھوں نے رسولؐ کو صلح کی پیش کش کی اور اس کے عوض کے طور پر فدک آپؐ کی خدمت میں پیش کیا ۔

کوئی قطعہ زمین تین طریقوں سے ارضِ اسلامی میں شامل ہوتا ہے :

(۱) ——— لشکر کشی اور قتال وجہاد کے ذریعہ کوئی زمین مسلمانوں نے فتح کی ہو، یہ زمین شرعی اصطلاح میں مفتوح العنوہ (یعنی قدرت وطاقت کے ذریعہ فتح کی گئی زمین) کہلاتی ہے ۔

(۲) ——— دوسرے ایسا قطعہ زمین جس کے باسی از خود اسلام قبول کرلیں ۔

(۳) ——— اور تیسرے وہ قطعہ زمین جس کے باسی نہ ہی مسلمان ہوتے ہیں اور نہ ہی اس زمین پر لشکر کشی اور قتال وجہاد کے ذریعہ مسلمان فتح یاب ہوئے ہوں ۔ بلکہ یہ زمین غیر مسلموں نے مصالحت اور جنگ سے بچنے کی خاطر مسلمانوں کے حوالے کردی ہو ۔

شریعت اسلامی ان تینوں طرح کی اراضی سے متعلق مخصوص قوانین رکھتی ہے ۔

وہ زمین جو مسلمان افواج نے جنگ کے ذریعہ فتح کی ہے وہ تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے ۔ اور ہر مسلمان جس قطعۂ اراضی پر آباد ہوگا وہ اس کا حق دار سمجھا جائے گا ۔

ایسی زمین جس پر بسنے والے خود اسلام قبول کرلیں وہ انہی نومسلموں کی ملکیت رہے گی ۔

اور ایسی زمین جو ان دونوں صورتوں کے علاوہ حاصل ہوئی ہو یعنی نہ تو جنگ وجہاد کے ذریعہ فتح ہوئی ہو اور نہ ہی اس پر بسنے والوں نے اسلام قبول کیا ہو بلکہ غیر مسلموں نے صلح اور جان بخشی کی خاطر ایسی زمین مسلمانوں کے حوالہ کردی ہو تو اس قسم کی زمین حکومتِ اسلامی کے سربراہ کی ملکیت ہوگی ۔ اور اس

سربراہ حکومت کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اسے جس طرح چاہے استعمال کرے۔

فدک چونکہ اسی قسم کی زمین تھی اس بنا پر یہ خاص رسولِ اکرمؐ کی ملکیت تھا جو سنی اور شیعہ روایات کے مطابق آیت: "وَآتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا" (سورہ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۲۶) کے نزول کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت فاطمۃ الزہراؑ کو بخش دیا۔[1]

بخشش فدک سے متعلق اہلِ سنت کے منابع سے معروف صحابی ابو سعید خدری سے بھی ایک حدیث منقول ہے کہ: لما نزل قوله تعالیٰ: "وَآتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ"، اعطیٰ رسول اللّٰہ فاطمه فدکاً۔ "جب یہ آیت نازل ہوئی کہ وَآتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ، تو رسول اللہؐ نے فدک کا علاقہ فاطمہؑ کو دے دیا"۔[2]

ممکن ہے کہ رسول مقبولؐ کے فاطمہؑ کو فدک بخش دینے کی وجوہات کے سلسلہ میں مختلف آراء پائی جائیں لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ فدک فاطمہؑ اور ان کے بعد اولادِ فاطمہ کی ملکیت تھا اور اسے ان سے چھین لینا ایک قبیح اور ناجائز فعل ہے اور صد افسوس کہ بعد وفاتِ رسولؐ حکومتِ اسلامی کے کارپردازوں نے فدک کو دخترِ رسولؐ سے چھین لیا۔

۲۸ صفر المظفر ۱۱ھ بروز سوموار رسول مقبولؐ جوارِ رحمتِ رب میں منتقل ہوئے اور بقول حضرت امیرالمومنینؑ: "آپ کے فوت ہونے سے نبوت و وحیِ الٰہی اور آسمانوں کی خبروں کا رشتہ جو کسی بھی مرنے والے کی موت پر قطع نہیں ہوتا قطع ہو گیا ہے۔" (نہج البلاغہ خطبہ ۲۲)

بعد وفاتِ رسولؐ سقیفہ کی کارروائی کے بعد حزبِ حاکم نے اہلِ بیتِ نبوت کے

---

[1] کشف الغمہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۲۔ درِ منثور تالیف جلال الدین سیوطی جلد ۴ صفحہ ۱۷۷

[2] بزاز، ابو یعلی، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے یہ حدیث ابو سعید خدری سے نقل کی ہے (کتاب میزان الاعتدال ج ۲ صفحہ ۲۸۸ اور کنز العمال ج ۲ ص ۱۵۸ نقل از تفسیر نمونہ جلد ۱۲ صفحہ ۱۰۴)

ایک اور حق کے غصب کی جانب قدم بڑھایا اور فدک کو سرکاری ملکیت قرار دے کر اس پر سے فاطمۃ الزہراؑ کے مزارعین کو بے دخل کر دیا۔ فاطمۃ الزہراؑ نے اس غصب کے خلاف دربارِ خلافت میں صدائے احتجاج بلند کی تو گو کہ آپ کا فدک پر قبضہ خود اس پر آپؑ ہی کی ملکیت کو ظاہر کرتا تھا لیکن پھر بھی خلیفۂ وقت نے آیۂ تطہیر کی مصداق خاتونِ جنت سے اس سلسلہ میں گواہ طلب کیے جب فاطمۃ الزہراؑ نے ام ایمنؓ اور حضرت علیؑ کو گواہ کے طور پر پیش کیا تو خلیفہ نے ان گواہوں کو قبول نہ کیا اور اپنے موقف کے حق میں ایک ایسی حدیث پیش کی جس کے راوی بھی تنہا خود ہی تھے اور کہنے لگے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ "ہم کوئی وراثت نہیں چھوڑتے ہم جو چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے"

حضرت ختمی مرتبتؐ کی فدک حضرت فاطمۃ الزہراؑ کو دینے سے یہ منشا نہ تھی کہ حضرت زہراؑ اور آپؑ کی اولاد اس کے ذریعہ پر آسائش زندگی بسر کرے اور وہ دنیاوی لذتوں سے لطف اندوز ہوں۔ کیونکہ حیاتِ پیغمبرؐ میں بیشتر واقعات اس نوعیت کے ملتے ہیں جن میں آنحضرتؐ نے اہل بیتؑ کو دنیاوی لذتوں اور آسائشوں سے دور رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔

فدک حضرت فاطمہؑ کو بخش کر حضور یہ چاہتے تھے کہ میرے بعد حضرت علیؑ کی خلافت مستحکم اقتصادی بنیاد پر استوار ہو اور علیؑ اس مال و دولت کے ذریعہ غربا اور مساکین کی داد رسی کر سکیں اور یوں آپؑ کی قیادت و رہبری کو تقویت حاصل ہو۔

حزبِ حاکم بھی فدک کی اس اقتصادی اور سیاسی اہمیت سے آگاہ تھی۔ اسی لیے اس نے اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں علیؑ اس مال و دولت سے استفادہ کر کے سیاسی طور پر مضبوط نہ ہو جائیں اسے فاطمہؑ کے ہاتھوں سے چھین لیا۔

جنابِ زہراؑ اور حضرت علیؑ کی جانب سے غصبِ فدک پر شدید احتجاج میں بھی سیاسی رنگ غالب تھا ورنہ یہی زہراؑ و علیؑ ہیں جو اپنی کل حیات میں دنیاوی لذتوں اور آسائشوں سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مسئلہ فدک میں بھی آپ کی جد و جہد کسی مادی طمع و لالچ کی

بنا پر نہ تھی بلکہ اس کے ذریعہ آپؑ حزب حاکم کی بدعنوانیوں کا پردہ چاک کر رہے تھے۔

عامۃ المسلمین نہ ہی خلیفۃ المسلمین کی صلاحیت واہلیت پر گہری نظر رکھتے تھے اور نہ ہی نااہل حکمران کی وجہ سے دین کی اساس وبنیاد اور شریعت کے اصولوں اور امت اسلامی کو لاحق خطرات سے آگاہ تھے۔ غرض ان کی نظر میں اس بات کی اہمیت نہ تھی کہ زمام اقتدار کس کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ وہ اس مسئلہ کو نہایت سادہ مسئلہ خیال کرتے تھے۔ اسی بنا پر انھوں نے خلافت کے غصب پر خاموش تماشائی کا کردار ادا کیا اور معدودے چند اصحاب کے سوا کسی نے اس غصب پر احتجاج نہ کیا۔

۱۴۰۰ سال گزرنے کے باوجود بھی عوام الناس کی ذہنیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے اور آج کے دور میں بھی افرادِ امت ایسے ہی لوگوں سے اپنی فلاح وصلاح اور شریعتِ اسلامی کے نفاذ و رواج کی امیدیں باندھے ہوئے ہیں جن کا نہ شریعت سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی یہ لوگ عوام کی فلاح وبہبود سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں۔

اور ستم بالائے ستم یہ کہ شریعتِ اسلامی کی برملا تضحیک اور لادینیت کا فروغ ان کے جوشِ ایمانی کو ذرہ برابر نہیں بڑھاتا لیکن معمولی مسائل پر یہ افرادِ قوم جوش وجذبات میں آجاتے ہیں۔

حضرت علیؑ امت کی اس ذہنیت سے آگاہ تھے اس بنا پر آپؑ نے اس وقت خاموشی اختیار فرمائی لیکن جب خلیفہ اوّل نے فدک پر اپنا ہاتھ صاف کیا تو حضرت علیؑ کو ایک ایسا موقع فراہم ہوا جس کے ذریعہ حزب حاکم کے فریب کا پردہ چاک کیا جاسکتا تھا کیونکہ یہ ایک ایسا جرم تھا جس کا قبح سب پر عیاں تھا۔

کتاب ہٰذا "فدک تاریخ کی روشنی میں" مسئلہ فدک پر حضرت آیت اللہ شہید سید محمد باقر الصدر کی ایک لافانی، اچھوتی اور منفرد تالیف ہے جس میں شہید صدر رضوان اللہ علیہ نے دخترِ رسولؐ حضرت فاطمۃ الزہرا صلوات اللہ علیہا کے موقف کے اثبات کے ساتھ ساتھ اس مسئلہ کی اہمیت اور ان مقاصد و اہداف پر تجزیہ و تحلیل کیا ہے جو مسئلۂ فدک کو اس قدر شد و مد سے اٹھانے کے پس پردہ موجود تھے خصوصاً مطالبۂ فدک کے پس پردہ موجود سب سے اہم مقصد اہلبیتؑ کے وارث و خلیفۂ رسولؐ ہونے اور اس طرح دخترِ رسولؐ کی جانب سے غصبِ خلافت کو برملا کرنے کے اقدام کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

خداوندِ عالم ہمیں اس کتاب کو پڑھ کر سمجھنے اور اس کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کا تعین کرنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام

"ناشر"

۱

انقلابی مناظر

انقلاب کی مُہم نفسِ زہراؑ میں

ایک مخدّرہ اس عالم میں کھڑی ہوئی ہے کہ اس کو حالات کا پورا یقین ہے اور سختیٔ موقف اس کے پیمانۂ صبر کو معمولی خوف و دہشت سے چھلکا نہیں سکتی اور اس کے حقیقی خیالات میں کسی قسم کا تردّد پیدا نہیں ہو سکتا اور قلق و اضطراب کے افکار اس کے راہِ انقلاب میں حائل نہیں ہو سکتے۔

اس لیے کہ یہ مخدّرہ استعدادِ کامل اور ثباتِ قدم کی اس بلندی پر ہے جو اس کو ہر سخت اقدام اور دفاعی اسلوب پر جرأت دلا رہی ہے۔ پس مخدّرہ نے اس راستہ کو اختیار کیا ہے جس پر چلنا ایک عورت کے لیے انتہائی دشوار ہے، اس لیے کہ عورت کی طبیعت ضعیف ہوتی ہے اور موقف انتہائی شدائد و مصائب کا حامل ہے جو ایک ادبی جرأتِ بیانی کا طالب ہے، اور ایک ایسی قدرت چاہتا ہے جس سے انقلابی مفاہیم الفاظ میں ڈھال دیے جائیں، اور حالاتِ حاضرہ کی ایسی تنقید کی جائے

کہ جس میں حیات کے مفاہیم اور دوام کے خطوط نمایاں ہو جائیں تاکہ ہر حرف ایک مستقل سپاہی اور ہر کلمہ تاریخ عقیدہ کی صحیح سند بن جائے، لیکن ان تمام امور کے باوجود ایمان اور راہِ حق میں اقدامات کا جذبہ عورت کے کمزور نفس میں طبیعت کے خلاف قوتیں پیدا کر رہا ہے اور سُست طبیعت میں ایسی طاقت ایجاد کر رہا ہے کہ جس کو کوئی ضعف و تردّد روک نہیں سکتا۔

اسی لیے مخدّرہ نے اس راستہ کو اختیار کیا جو اس کی طبیعت کے موافق اور حق کی اعانت و نصرت پر کمربستہ شخصیت کے مناسب ہو۔

اس مخدّرہ کے ساتھ اس کے اقربا اور قوم کی کچھ عورتیں اور بھی تھیں، جس طرح بکھرے ہوئے ستارے کہ ان کو یکجا کرنے والا کوئی نہ تھا، لیکن سب اس جذبۂ دفاع و انتقام میں برابر تھیں۔

اس جماعت کی قائد وہ تمام کلمات اپنے ذہن میں لا رہی ہے کہ جنھیں عدالت میں پیش کرنا ہے، اور یہ تصور اس کے قوتِ قلب و سکونِ دل میں برابر اضافہ کر رہا ہے، حق کی طاقت اس کے دل میں بڑھتی جا رہی ہے اور ارادوں کی پختگی اور چھینے ہوئے حقوق سے دفاع کے جذبات اور سخت موقف سے مقابلہ کے لیے عزائم میں زیادتی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت نے اس سخت وقت میں اپنے مرد کا دل عاریۃً لے لیا ہے تاکہ ان سخت حالات کا مقابلہ کرے اور ان سخت مصائب کا سامنا کرے کہ جن سے پہاڑ ٹکڑے ہو جائیں اور سخت چٹانوں میں زلزلہ پیدا ہو جائے۔

اس ہولناک موقف میں،

یہ مجاہدہ مخدّرہ اس شان سے کھڑی ہے کہ حزن و اندوہ کے بادل اس کے سر پر سایہ افگن ہیں۔ اس کے جسم اطہر کا رنگ متغیّر، چہرہ پر غضب کے

آثار نمودار، دل محزون، قلب بے چین، جسم نڈھال اور اعضاء و جوارح ضعیف ہو چکے ہیں لیکن نفسِ مطہر میں گہرے افکار کی درخشندگی اور اطمینانِ قلب کی زیادتی ہے۔

یہ تمام باتیں اس لیے نہیں ہیں کہ،

اس مخدرہ کو کسی نام کی امید ہے یا کسی اچھے نتیجے کی توقع ہے بلکہ یہ نورانیت تو اپنے افکار کی پسندیدگی اور انقلاب کی مسرت سے ہے اور یہ اطمینان اپنے مقصد کی کامیابی کی امید سے ہے۔ نہ اس انداز کی کامیابی جسے دنیا سمجھتی ہے بلکہ دوسرے رنگ کی۔ اس لیے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وقتی شکست بڑی کامیابی کا مقدمہ بن جاتی ہے، جیسا کہ ہوا۔

چنانچہ آج ساری امت اس مقدمہ میں انقلاب[1] کی تعریف کر رہی ہے بلکہ اس مخدرہ کے ثبات و شجاعت سے قوتِ قلب کے درس حاصل کر رہی ہے اس عالم میں مخدرہ کا نفس اپنے ماضی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

وہ وقت، جب سعادت کی موجیں اس کی زندگی سے کھیل رہی تھیں ـــــــــــــــ !

وہ وقت جب اس کا باپ زندہ تھا، اور اس کا گھر قدیمی حکومت کا مرکز اور مستقل شرافتوں کا ستونِ محکم بنا ہوا تھا۔

شاید انھیں افکار میں وہ منظر بھی سامنے آ گیا ہو،

جب اس کا باپ اسے اپنے سینے سے لگائے ہوئے عاقلانہ محبتوں سے اس کی تربیت کر رہا تھا اور اس کے مقدس لبوں کے بوسے لے رہا تھا، جو کہ صبح و شام اس کی روحانی غذا تھی۔

---

[1] سرور کشمیری فرماتے ہیں ؎

ہیں تیرے فرمان شاہزادی فدک کے قصے ہیں یہ سیاسی ۔ جو تو نہ اٹھتی تو کہہ نہ سکتا خلافِ غاصبہ کا پردہ

پھر خیال پلٹا اور یہ نظر آیا کہ،

اب زمانہ دوسرا ہو چکا ہے، اب وہ گھر کر جو فانوسِ نورِ وحدت اور رمزِ نبوت تھا جس کی شعاعیں عرش سے باتیں کر رہی تھیں، چند جماعتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور اس کا وہ ابنِ عم کہ جو اسلام کی دوسری عظیم شخصیت ہے،

جو بابِ علمِ نبیؐ، وزیرِ مخلصِ رسولؐ اور ہارونِ رسالت ہے،

جس کی ابتدا، ابتدائے رسالتؐ سے متحد تھی، جو ابتدا میں رسولؐ کا ناصر اور انتہا میں اس کی امیدوں کی آماجگاہ تھا۔ خلافتِ رسولؐ سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کی وہ فضیلتیں جن کے زمین و آسمان شاہد ہیں ناقابلِ توجہ بنا دی جاتی ہیں اور اس کے وہ اسلامی کارنامے جن میں وہ یکتا تھا درجۂ اعتبار سے ساقط کر دیے جاتے ہیں۔ ان بعض اقدار کی بنا پر جو اس وقت کی اصطلاح میں ڈھالے گئے تھے۔

اس وقت جتنا عورت کے مقدر میں تھا اس نے گریہ کیا۔ نہ وہ گریہ جو چہرے سے نمایاں ہو جائے اور سامنے سے جس کا اندازہ کر لیا جائے بلکہ وہ دل کے شعلے، نفس کا اضطراب، قلب کی گہرائی میں حسرتوں کی فراوانی اور نتیجہ میں چشمِ مقدس سے ٹپکتے ہوئے دو آنسو تھے۔

ابھی کچھ دیر نہ گزری تھی کہ یہ مخدرہ اپنی ہمجولیوں کو لیے ہوئے بھڑکتے شعلے کی طرح میدانِ جہاد تک پہنچی اور ایسا قیام کیا جو تاریخ میں دوامی حیثیت اختیار کر گیا۔ وہ جہاد کیا جس میں عورت کی جملہ امکانی قوتیں صرف کر دیں۔

اور قریب تھا کہ یہ نئے انداز کا جہاد خلافتِ وقت کو تباہ و برباد کر دے، اگر وقت کی شدت اور مصائب کی فراوانی حائل نہ ہو جاتی۔

یہ مخدرہ ہیں ——— فاطمہ زہرا صدیقۂ کبریٰ بنتِ رسولؐ۔ ریحانِ نبوت، مثالِ عصمت، شعاعِ نورِ وحدت اور مسلمانوں میں رسولؐ کی امانت کہ جو مسجد

کی طرف اس عالم میں تشریف لے جا رہی ہیں کہ ،

اپنے ہاتھوں سے ایسا باپ کھو چکی ہیں کہ جو تاریخِ انسانیت میں محبت و شفقت اور برکت کے اعتبار سے بے مثل و بے نظیر تھا۔

یہ حادثہ وہ ہے کہ جس سے انسان یا تو تلخیٔ موت چکھنے پر آمادہ ہو جائے یا پھر موت اس کو انتہائی خوشگوار، شیریں اور بہتر نظر آنے لگے۔

یہ ہیں فاطمہ زہراؑ کے اس وقت کے حالات جب آپ کے والد نے اس دنیا سے رحلت کی اور جوارِ رحمتِ الٰہیہ میں جگہ پائی۔

حالات کی تلخی اور شعور کی پختگی

حوادث انھیں سختیوں تک محدود نہ رہے، بلکہ فاطمہؑ کو ایک دوسرے حادثہ کا بھی سامنا کرنا پڑا جس کی تاثیر نفسِ طاہرہ میں باعتبار حزن والم و مصیبت و اذیت پہلے حادثہ سے قطعاً کم نہ تھی۔

اور وہ یہ کہ خاندانِ رسالت کی قدیمی شرافت جو ان کے پاس ابتدائے تاریخ سے تھی سلب کر لی گئی۔ یعنی سیادتِ امت اور زعامتِ ملت کا حق علیؑ سے چھین لیا گیا۔

منشاءِ قدرت یہ تھا کہ آلِ محمدؐ امتِ رسولؐ کے ولی ہوں، اس لیے کہ یہ اجزائے رسالت و نبوت ہیں۔ لیکن افسوس کہ حالاتِ زمانہ نے ریاست کا رُخ موڑ دیا، اور منصبِ حکومت کو آلِ رسولؐ سے چھین کر اپنے خود ساختہ امراؤ رؤساء کے حوالے کر دیا۔

یہ وہ مصائب تھے کہ جن کی وجہ سے فاطمہؑ اپنی مقدس شرافتوں اور ابدی ریاستوں سے محروم ہو گئیں اور اس وقت ان کے مرکزِ آلام و احزانِ نفس نے انھیں اس اقدام پر آمادہ کیا۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ،

اگر فاطمہؑ جیسا کوئی دوسرا انسان اس طرح اس قسم کے مجاہدات اور شجاعتوں کا مظاہرہ کرنا چاہتا تو حکومت کا لقمہ بن کر رہ جاتا۔ اس لیے کہ حالات اتنے ناگفتہ بہ ہو گئے تھے کہ اشاروں پر عتاب، گفتگو پر حساب اور افعال پر عقاب ہو رہا تھا۔ بھلا کس کی مجال تھی کہ اس عالم میں حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرتا۔ پھر وہ احکام جن پر حکومت کی بنیاد اور اس کی اساس قائم ہو۔

ہاں، اگر مجاہدہ بنتِ رسولؐ، بضعۃ النبیؐ آئینۂ جمالِ رسالت ہو تو بلاشک وہ بے خطر رہ سکتی ہے نہ کسی مادی طاقت کی بنا پر بلکہ اپنی شرافتوں کی بنا پر اور اس لحاظ سے کہ عورت کے ساتھ احکام حکومت میں مراعات کی جاتی ہیں۔

انقلابی طاقتیں

ایک مرتبہ فاطمہؑ اپنے پاکیزہ خیالات کے ساتھ ماضی کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور باپ کا وہ زمانہ یاد کرتی ہیں،

جو کہ ان کے انتقال کے بعد فاطمہؑ کے ذہن میں بطور یادگار محفوظ رہ گیا ہے، جو ہر وقت فاطمہؑ کے نفس میں ایک نیا شعور اور تازہ احساس پیدا کر رہا ہے۔ جس سے فاطمہؑ ہر وقت ایک نئی مسرت و لذت حاصل کرتی ہیں۔

فاطمہؑ اگرچہ روز و شب کے اعتبار سے باپ سے دور ہو گئی ہیں لیکن خیالات و افکار کی وجہ سے باپ کے زمانہ سے ہمیشہ متحد ہیں۔

فاطمہؑ کے پہلو میں قدرت کا سرچشمہ ہے جو خشک نہیں ہو سکتا۔ انقلابی طاقتیں ہیں جو کم نہیں ہو سکتیں۔ نبوتِ محمدؐ کی شعاعیں ہیں جو رہنمائی

کر رہی ہیں۔

جب فاطمہ نے دل میں انقلاب کی ٹھان لی اور ایک مرتبہ اپنے احساسات کا سہارا لے کر ماضی کی طرف متوجہ ہوئیں تاکہ اس سخت وقت میں اپنے باپ کے تذکروں سے مدد حاصل کریں تو ایک مرتبہ فاطمہؑ نے زبانِ حال سے آواز دی:

"ایک نظر اس طرف، اے صورتِ سعادت!
فاطمہؑ تجھ سے جدا ہو کر ایک ایسی شقاوت میں مبتلا ہو گئی ہے کہ
جو ناقابلِ برداشت ہے،
اے عزیز ترین و محبوب ترین روح! مجھ سے باتیں کر اور اپنے نورِ الٰہی کا فیضان کر، جیسے کہ تو سابقاً کیا کرتی تھی۔

اے پدرِ بزرگوار! اگر آپ کو میری باتیں اچھی معلوم ہوں تو میں آپ سے باتیں کروں، میں اپنے غم واندوہ کو پراگندہ کرنا چاہتی ہوں، جیسا کہ آپ کے سامنے کیا کرتی تھی، میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ آپ کا سایۂ رحمت جو مجھے آتشِ دنیا سے بچاتا تھا اب باقی نہیں رہا۔

اے بابا! آپ کے بعد وہ مصائب گزرے کہ اگر
آپ موجود رہتے تو شاید اتنے مصائب ہم پر نہ پڑتے۔"

اے ماضی کے تذکرو!

ہمارے سامنے اپنی باتیں دہراؤ تاکہ میں ان میں سے ایک جنگ کی بنیاد رکھوں، ایسی جنگ کہ جس میں کوئی سستی نہ آنے پائے۔

ان لوگوں کے خلاف جو از خود یا بخواہش مردم میرے باپ کے منبر پر قابض ہو گئے ہیں اور حقوقِ آلِ محمدؐ کا خیال نہیں کرتے بلکہ بیتِ عصمت کو تباہ کرنے پر آمادہ ہیں۔ مجھے میرے باپ کی جنگیں یاد دلاؤ۔ کیا میرے باپ مجھ سے بیان نہیں کرتے تھے

کہ میرا بھائی میدان کا مرد، اور جہاد کا سپاہی، ——————
—————— تمام ساتھیوں سے بہتر، ایسے سخت وقت میں جب سب میدان چھوڑ کر چلے جائیں، ثابت قدم رہنے والا ہے۔

اے ماضیٔ حبیب!

کیا اس کے بعد ممکن ہے کہ میں دیکھوں کہ علیؑ زیرِ منبر ہوں اور ابوبکر بالائے منبر، لا واللہ!

مجھے بتا دے اے میرے باپ کے زمانے!

کیا یہ ابوبکر وہی نہیں ہے کہ جس پر سورۂ برأت کی تبلیغ کے سلسلے میں وحیٔ الٰہی نے اعتماد نہ کیا تھا۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علیؑ ہی وہ اسلامی نمائندہ ہے کہ جس پر ہر اسلامی مہم میں اعتماد ہونا چاہیئے۔

مجھے باقاعدہ وہ زمانہ یاد ہے جب میرے باپ جنگ کے لیے تشریف لے گئے تھے اور علیؑ کو اپنا نائب بنا دیا تھا۔ تو لوگوں نے اس پر بڑی بڑی باتیں کیں۔ لیکن علیؑ مثلِ کوہ ثابت قدم رہے اور آپ نے کوئی توجہ نہ کی۔

میں نے چاہا کہ علیؑ، پیغمبرؐ سے اس کی شکایت کریں۔ یہاں تک کہ انھوں نے رسولؐ سے جا کر بیان کیا اور اس حالت میں پلٹے کہ ان کے چہرے سے آثارِ مسرت ہویدا تھے اور کمالِ مسرت سے میرے پاس آ کر ایک آسمانی بشارت دی اور بیان کیا کہ رسولؐ نے استقبالِ عظیم کے بعد مجھے بمنزلۂ ہارونؑ قرار دیا۔[1]

اے زمانے!

ہارونِ موسیٰؑ تو شریکِ حکومت و امامتِ امت ہوں،

---

[1] حدیثِ منزلت، صحیح بخاری و مسلم و خصائص نسائی و مستدرک حاکم و جامع ترمذی و مروج الذہب مسعودی وغیرہ میں موجود ہے۔ ریاض النضرہ ج ۲ صـ ۲۱۳

لیکن ہارونِ محمدؐ ان مناصب سے محروم کردیا جائے یہ ہرگز نہیں ہوسکتا —
اب تصوراتِ فاطمہؑ پکار اٹھے۔
یہی وہ انقلاب ہے جس کی خبر قرآن نے دی ہے
اے اصحابِ محمدؐ! رسولؐ کے بعد دینِ جاہلیت کی طرف پلٹ
نہ جانا۔ یقیناً یہی وہ لوگ ہیں جو دین سے گریزاں ہیں۔ ان پر
مجہول منطق نے غلبہ کرلیا ہے۔ اسی لیے سقیفہ میں ایک فریق
نے اپنی کثرت و عزت کو پیش کیا اور دوسرے نے اپنی قرابت
کو، اور قرآن وسنّت کو درجۂ اعتبار سے ساقط کردیا۔

پھر آواز دی :

اے خواتینِ محمدؐ! کہ جو میری رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ
رہے ہیں، یہ وہی ہے کہ جس نے مکّہ میں آپؐ پر ہجوم کیا اور آج ہم اہلِ بیتؑ کے
دروازے پر آگ جلا رہا ہے۔

اے رُوحِ مادری!

جہادِ اسلامی کا وہ درس جو آپ نے مجھے دیا ہے، ناقابلِ فراموش
ہے۔ آپ نے بابا کے شانہ بشانہ جہاد کیا، میں بھی آپ کے نقشِ قدم پر ہوں۔

لبّیک! لبّیک! اے مادرِ گرامی! میرے دل کی گہرائیوں میں
آپ کی آوازیں ہیں جو مجھے حکامِ وقت کے مقابلہ پر آمادہ کر رہی ہیں۔

مادرِ گرامی!

میں عنقریب ابوبکر سے جاکر کہوں گی کہ تم نے بابا پر بہتان باندھا ہے،
میں تو دنیا سے چلی جاؤں گی لیکن قیامت میں تم سے ملاقات کروں گی، اس عالم میں کہ
حاکم اللہ ہوگا، رئیس و زعیم میرا باپ ہوگا۔ موقف قیامت کا ہوگا۔ میں چاہتی ہوں کہ مسلمانوں کو

ان کے انجام سے آگاہ کر دوں اور انھیں وہ سیاہ مستقبل دکھا دوں جو کہ انھوں نے اپنے ہاتھوں تاریک بنا لیا ہے۔

میری تمنا ہے کہ

میں ان سے کہہ دوں کہ تم نے خلافت کو دودھ کی خاطر حاملہ بنایا ہے، لیکن عنقریب یہ دودھ، خون کی شکل اختیار کرے گا۔ اس میں اہل باطل گھاٹے میں رہیں گے اور سابقین کے نقش قدم پر چلنے والے پہچان لیں گے کہ ان کی بنیاد کیسی تھی۔

فاطمہؑ میدانِ عمل کی طرف چلیں، اس عالم میں کہ ان کے دل میں محمدی توہین، علوی شجاعت، خدیجہ کی روحانیت اور امت کی شفقت و ہدایت کا جذبہ تھا۔

راہِ انقلاب

کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ راہ جو فاطمہ زہراؑ نے انقلاب کے لیے طے کی کچھ طولانی نہ تھی۔ اس لیے کہ جس گھر سے انقلابی شرارے اٹھے تھے وہ علیؑ کا گھر تھا جس کو اصطلاحِ رسولؐ میں بیت النبوۃ کہا جاتا تھا۔

اور یہ گھر مسجد کے ہمسایہ میں تھا۔

مسجد اور دروازۂ سیدہ میں ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ اس طرح کہ مسجد اور گھر کے درمیان ایک دیوار سے زائد کا فاصلہ نہ تھا۔

اس مقام پر دو احتمال ہیں۔

یا فاطمہؑ اس دروازہ سے داخل ہوئیں جو مسجد کے اندر تھا یا پھر صدر دروازہ سے۔ اگرچہ یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شہزادیؑ صدر دروازہ سے آئی ہوں، جیسا کہ سیاقِ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ خصوصی دروازہ سے آنے میں مسجد سے ابوبکر تک جانے میں کوئی دیر نہ لگتی اور نہ چلنے کی ضرورت تھی حالانکہ راوی؛ فاطمہؑ

کی رفتار کی توصیف کرتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی رفتار سے ذرا بھی مختلف نہ تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ توصیف اس چال کی ہے جو ابوبکر تک پہنچنے میں دیکھی تھی تو خلافِ عربیت ہوگا اس لیے کہ مسجد میں قدم رکھنا ہی ابوبکر کے سامنے جانے کے مرادف ہے۔ بہرحال قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاطمہؑ صدر دروازہ سے داخل ہوئیں۔

فاطمی مظاہرہ کے شرکاء

روایت بتلاتی ہے کہ فاطمہؑ کے ساتھ کچھ ہم قوم و قرابت عورتیں بھی تھیں۔ اس اجتماع اور صدر دروازہ سے جانے کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ لوگوں کو متوجہ کرنا، اور ان کے التفات کو اس امر کی طرف مبذول کرنا کہ وہ مسجد میں جمع ہوکر یہ دیکھیں کہ فاطمہؑ کا مقصد کیا ہے اور بنتِ رسولؐ کیا کہنا چاہتی ہے،

تاکہ طرفین کے درمیان مقدمہ علی الاعلان ہو اور دنیا حق و باطل میں بآسانی امتیاز پیدا کر سکے۔

ایک منظر اور اس کا پس منظر

روایت نے یہ بتایا کہ فاطمہؑ پیغمبرؐ کی رفتار سے مسجد میں تشریف لائیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس فلسفہ کو واضح کیا جائے۔

اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ فاطمہؑ کی عادت رہی ہو، اس لیے کہ یہ بیٹی جملہ افعال و اقوال میں باپ سے مشابہ تھی۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ فاطمہؑ نے قصداً یہ رفتار اختیار کی ہو اور یہ چاہا ہو کہ عوام کے خیالات اور جمہور کے احساسات کا رُخ ماضی قریب کی طرف موڑ دیں تاکہ وہ اس دور کو یاد کریں جب اسی مخدرہ کے باپ کے سایۂ رحمت میں جیبن کی زندگی

بسر کر رہے تھے اور یہی احساس وشعور وہ ہے کہ جو فاطمہؑ کے بیان کی تمہید ہو جائے گا اور
لوگوں کو دعوتِ فاطمہؑ کے قبول کرنے پر آمادہ کرے گا اور فاطمہؑ کو ان کے اقدامات میں
کامیاب بنائے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ،

قلب راوی متاثر ہوا اور اس نے شعوری یا لاشعوری طور پر
جملہ تاریخی وقائع کے ساتھ فاطمہؑ کی رفتار کا تذکرہ بھی کر دیا۔

ایک کلمہ آمال وآلام انقلاب کے متعلق

یہ ایک فاطمی فریاد تھی جس کو آسمانوں نے سنا اور اب یہی آواز حقیقت مذبوحہ
اور اقدام مایوس کا مرکز بن گئی جس کے بعد کچھ چہروں پر امیدوں کی مسکراہٹ نظر آئی
لیکن آخر تک پہنچتے پہنچتے یہ مسکراہٹ بجائے قہقہہ کے سسکیوں میں بدل گئی اور مسلمانوں
کو دائمی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ وہ انقلاب تھا جس سے انقلاب کرنے والی مخدرہ کا مقصد کچھ نہ تھا۔
سوائے اس کے کہ یہ انقلاب تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو جائے اور دنیا پر حق و باطل نمایاں
ہو جائیں۔ اس اعتبار سے یہ انقلاب انتہائی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ اگرچہ نگاہِ ماری
اسے ناکام سمجھی۔

اس کی کامرانی کی وضاحت آئندہ آئے گی۔

(۲)

فدک

فدک تاریخ اسلامی کے ابتدائی دور میں

فدک، مدینہ سے دو یا تین دن کے فاصلہ پر حجاز کا ایک قریہ ہے۔ ابتدائے تاریخ سے یہ یہودیوں کی زمین تھی۔ چنانچہ ۷ھ تک یہودی اس پر قابض رہے۔ ۷ھ میں ان لوگوں نے خوفِ رسولِ اسلامؐ سے نصف[1] یا پورے فدک کا رسولؐ سے مصالحہ کر لیا۔

اس دن سے فدک کی اسلامی تاریخ کا آغاز ہوا اور یہ ملکِ خاصِ رسولِ اسلامؐ بنا۔ اس لیے کہ مسلمانوں نے یہاں کوئی جنگ نہ کی تھی۔

پیغمبرؐ نے یہ زمین فاطمہؑ کے حوالہ کر دی۔ وقتِ وفاتِ نبیِ اکرمؐ تک فدک انھیں کے ہاتھوں میں رہا۔ اس کے بعد بقول ابن حجر خلیفہ نے اسے فاطمہؑ سے چھین لیا اور اس کو اہم مصادرِ مالیہ، عمدۂ ثروتِ دولتِ اسلامیہ قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ

---

[1] بخاری ۵، صفحہ ۱۶۹، مترجم

خلافت[۱] عمر کو ملی، انھوں نے فدک وارثانِ رسول ص کو دے دیا اور یہ زمانۂ عثمان تک ان کے قبضہ میں رہا۔ عثمان نے اسے مروان بن الحکم کو بخش دیا۔ اس کے بعد تاریخ خاموش ہو جاتی ہے۔

لیکن اتنا بہرحال ثابت ہے کہ علی ع نے مروان سے فدک بھی جملہ اموال غارت شدہ بنی امیہ کی طرح چھین لیا۔

فدک[۲] عہدِ امیرالمومنین ع میں

خلیفۂ وقت کے بعض حمایت کنندگان کا خیال ہے کہ فدک علی ع کے زمانہ میں بھی شیخین ہی کی طرح استعمال ہوتا رہا۔ اور دلیل یہ ہے اس امر کی کہ فدک علی ع کی نظر میں حق خاص فاطمہ ع نہیں تھا۔

میں اس وقت تقیہ کی بحث چھیڑ کر امیرالمومنین ع کی سیرت کی توجیہ نہیں کرنا چاہتا، بلکہ میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ

علی ع نے فدک میں سیرتِ صدیق پر عمل کیا ہو۔

اس لیے کہ تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ علی ع، فدک کو اولادِ فاطمہ ع کا حقِ خاص ضرور سمجھتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے اس کا اظہار عثمان ابن حنیف کے مکتوب میں فرمایا ہے۔

بنا بریں ممکن ہے کہ آپ حاصلاتِ فدک صرف اولادِ فاطمہ ع پر صرف کرتے

۱؎ اس بیان کی ذمہ داری اہلِ تاریخ پر ہے (مؤلف)

اس بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر کی پیش کردہ حدیث نحن معاشر الانبیاء... پر حضرت عمر کو بھی اعتماد نہیں تھا ورنہ مال مسلمین کو وارثانِ رسول ص کے حوالے نہ کرتے یہ اور بات ہے کہ کل آپ ہی نے فدک نہ دینے پر اصرار زور صرف کیا تھا۔ چہ کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی (مترجم)

رہے ہوں اور اس امر کی تاریخی شہرت بھی ضروری نہیں ہے۔ اس لیے کہ مال مالکِ حقیقی ہی کے ہاتھ میں تھا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ غلّات فدک کو مصالح مسلمین میں صرف کرتے رہے ہوں لیکن وارثانِ فاطمہؑ کی اجازت سے۔

جیسا کہ ایک احتمال یہ ہے کہ اولادِ فاطمہؑ نے فدک کو وقف کر کے صدقۂ عامہ قرار دے دیا ہو۔

فدک اور حکومتوں کی عالمی سیاست

اس کے بعد جب معاویہ حاکم بنا تو اس نے حق مغصوب کا اور بھی استخفاف کیا اور ایک ثلث فدک مروان بن الحکم اور دوسرا عمر بن عثمان اور تیسرا ثلث اپنے بیٹے یزید کو دے دیا۔ یہ لوگ اس پر متصرف رہے، یہاں تک کہ تمام فدک مروان کے ہاتھ لگ گیا۔

اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز بن مروان قابض ہوئے۔ انھوں نے فدک اولاد فاطمہؑ کو واپس کر دیا۔ اور والی مدینہ ابوبکر بن عمر بن حزم کو خط لکھا کہ یہ اولاد فاطمہؑ کو دے دیا جائے۔ اس نے جواب دیا۔ فاطمہؑ کی اولاد آلِ عثمان اور آل فلاں و آلِ فلاں بھی ہیں۔ میں کیسے دوں؟

اس نے پھر لکھا کہ اگر میں تجھے کسی گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیتا تو تو اس کا رنگ پوچھتا۔ لہٰذا اب میرا خط پاتے ہی فوراً اسے اولاد فاطمہؑ پر تقسیم کر دے جو

---

[1] یہ احتمال زیادہ قوی ہے اس لیے کہ اگر صرف اولاد فاطمہ پر صرف ہوتا تو دوسرے لوگوں کے دینے کا کیا مطلب ہے جیسا کہ مکتوب ابن حنیف میں ہے یا اگر وقف ہوتا تو پھر اولاد فاطمہؑ کے لیے واپس لینا کیونکر جائز ہوتا۔

کہ علیؑ کی اولاد میں ہوں۔
بنی امیہ نے اس بات سے عمر ابن عبدالعزیز پر سخت اعتراض کیا اور کہا کہ تم نے شیخین کی توہین کی۔
بعض کا خیال ہے کہ عمرو بن قیس ایک جماعتِ اہلِ کوفہ کے ساتھ اس کے پاس گیا اور سخت عتاب کیا۔ اس نے کہا:
تم جاہل ہو اور میں عالم۔ تم بھول گئے اور میں نے یاد رکھا ہے۔
ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے اپنے باپ سے انھوں نے اپنے جَد سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ:

"فاطمہؑ میری پارۂ جگر ہے جس نے اسے ناخوش کیا اس نے مجھے ناراض کیا اور جس نے اسے خوش کیا اس نے مجھے راضی کیا۔"

یاد رکھو! فدک عہد ابوبکر و عمر میں ان کے پاس تھا۔ اس کے بعد مروان کے ہاتھ لگا، اس نے میرے باپ عبدالعزیز کو دیا۔ اب ہم اس کے وارث ہوئے۔ کچھ حصے ہمارے بھائیوں نے ہمیں ہبہ کر دیئے کچھ ہمارے ہاتھ فروخت کر دیئے، اب جب تنہا ہماری ملک ہے تو ہم جسے چاہیں دے دیں۔ تمھیں حقِ اعتراض نہیں۔
وہ بولے، اگر ایسا ہی ہے تو اصل فدک رکھ لو، اس کا منافع ان پر تقسیم کر دو۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔
اس کے بعد یزید بن عبدالملک نے فدک اولادِ فاطمہؑ سے چھین لیا اور وہ اولادِ مروان میں ان کے خاتمہ تک رہا۔
جب ابوالعباس سفاح خلیفہ بنا تو اس نے فدک عبداللہ بن الحسن بن الحسن بن علی بن ابی طالبؑ کو پلٹا دیا۔ ابوجعفر منصور نے زمانۂ حکومت میں بنی حسنؑ سے

چھین لیا ۔۔۔۔۔۔ مہدی بن منصور نے فاطمیین کو دے دیا ۔۔۔۔۔۔ موسیٰ بن مہدی نے پھر لے لیا اور یوں ہی بنی عباس کے ہاتھ میں رہا ۔ یہاں تک کہ مامون خلیفہ ہوا اس نے ۲۱۰ھ میں بنی فاطمہؑ کو واپس کر دیا اور اپنے والی قثم بن جعفر کو مدینہ لکھا :

" اما بعد ! امیرالمومنین ! دین خدا ، خلافت رسولؐ اور قرابت نبیؐ میں ایک خاص مقام کی بنا پر زیادہ مستحق ہے کہ سنت پیغمبرؐ پر عمل کرے اور رسولؐ کے صدقات وعطایا کو اس کے اہل تک پہنچا دے ، اللہ امیرالمومنین کو توفیق دے اور خطاؤں سے محفوظ رکھے اور ان میں رغبتِ عمل کا جذبہ پیدا کرے اور یہ بات واضح ہے کہ فدک پیغمبرؐ نے فاطمہؑ کو عطا کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں آج تک کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ اب امیرالمومنین کی بھی رائے ہے کہ اسے ان کے ورثا کو واپس کر دے ، اس لیے کہ اقامۂ حق و عدل ہی وسیلۂ تقرب الٰہی ہے اور تنفیذ امر وعطاء صدقات ہی وسیلۂ قربتِ رسولؐ ہے ۔ امیر کا حکم ہے کہ اس امر کو دیوانوں میں حفظ کر لیا جائے اور عاملین کو اس طرح کی اطلاع دے دی جائے بلکہ اگر بعد وفات نبیٔ اکرمؐ سے ہر موسم میں منادی کرائی جائے کہ ہر شخص اپنے صدقات وعطایا کا تذکرہ کرے تاکہ اس کا قول قبول کیا جائے تو اس امر میں فاطمہؑ سب سے زیادہ مستحق ہے کہ ان کا قول مانا جائے اب امیرالمومنین نے ایک خط اپنے غلام مبارک طبری کو بھی لکھوا دیا ہے کہ فدک جملہ حدود کے ساتھ بنی فاطمہؑ کو واپس کر دے اور ان کے جملہ حقوق وغلات وغلام وغیرہ کا تحفظ کرے اور یہ تمام اموال محمد بن یحییٰ بن الحسین ؑ بن زید بن علیؑ ابن الحسین بن علیؑ بن ابی طالب

اور محمد بن الحسنؑ بن علیؑ ابن الحسینؑ بن علیؑ ابن ابی طالب کو دے
دیے جائیں۔ یہ دونوں امیر کی طرف سے ولی امر ہیں۔ اس رائے
کو بخوبی سمجھ لے۔ اس امر کے لیے خدائی الہام اور توفیق غیبی ہے
جس سے امیر کو تقرب خدا اور رسولؐ حاصل ہوگا۔ اب تجھے چاہیے کہ
محمد بن یحییٰ اور محمد بن عبداللہ کے ساتھ وہی سلوک کرے جو مبارک
طبری کے ساتھ کرتا تھا۔ بلکہ تجھے ان دونوں کی اعانت کرنی چاہیے
تاکہ غلات میں اضافہ ہو اور قریہ باقاعدہ آباد ہو سکے۔

فقط والسلام

جب متوکل کی بیعت کی گئی تو اس نے فدک کو فاطمیین سے چھین لیا اور[1]
اس کو عبداللہ بن عمر بازیاد کے حوالہ کر دیا۔ اس باغ میں ۱۱ خرمہ کے وہ درخت تھے جنھیں خود
رسول اکرمؐ نے لگایا تھا۔ عبداللہ ابن عمر نے ایک شخص کو مدینہ بھیجا جس کا نام بشران بن بنی امیہ
ثقفی تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر تمام درخت کاٹ ڈالے۔ جب پلٹ کر آیا تو مفلوج ہو گیا۔

فاطمیین کا فدک سے آخری تعلق عہد متوکل تک رہا۔ اس کے بعد یہ
ابن عمر بازیاد کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔

یہ فدک کی ایک مختصر داستانِ پریشان ہے جو کسی ایک قاعدہ و قانون پر
درست نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ داستان خواہشاتِ ہوا و ہوس کی پیداوار ہے کہ جو سیاست وقت
کے اعتبار سے بدلتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ فدک بالکل خالی از عدل و انصاف بھی نہیں
اس لیے کہ کبھی کبھی یہ مال اپنے مالک تک بھی پہنچا ہے۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ اجتماع اسلامی میں

---

[1] ان تفصیلات کو حسب ذیل کتب میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔
فتوح البلدان ص ۳۹-۴۱، تاریخ یعقوبی ۳ ص ۴۸، عقد فرید ص ۳۲۳، معجم البلدان ۴ ص ۲۴۳، تاریخ ابن کثیر ۹ ص ۲۰۰
شرح ابن ابی الحدید ۴ ص ۱۰۳، تاریخ الخلفاء ص ۱۵۴، جمہرۃ رسائل العرب ۳ ص ۵۱۰، اعلام الناس ۲ ص ۲۱۲ (مترجم)

فدک نے بڑی اہمیت پیدا کر لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس مشکل کا ہر عہد میں نیا حل پیدا کیا گیا۔ اور ہر شخص نے اہلِ بیتؑ سے اپنے تعلق کے اعتبار سے اس میں تصرف کیا۔ اگر حاکم کی رائے معتدل و مستقیم رہی تو اس نے فدک اس کے وارثِ اصلی کو واپس کر دیا اور اگر عقل و رائے میں فتور پیدا ہو گیا تو غصبِ فدک بادشاہ وقت کا پہلا کارنامہ قرار پایا۔

نظرِ اسلامی میں فدک کی قیمت معنویہ کا اندازہ دعبل خزاعی کے اس قصیدہ سے ہوتا ہے جو انھوں نے مامون کے ردِّ فدک کے وقت نظم کیا تھا جس کا مفہوم یہ ہے:

"آج زمانے کے چہرہ پر تبسم کی لہریں دوڑ رہی ہیں اس لیے کہ مامون نے فدک کو اس کے حقیقی مالک کے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔[1]"

فدک کی مادی اہمیت اور اس کے دلائل

اس مقام پر یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ فدک کسی معمولی زمین یا باغ کا نام نہیں ہے جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔ بلکہ یہ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ فدک کے اموال سے ایک ثروتِ جمہ کی تشکیل ہو سکتی تھی۔ البتہ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ میں اس کی سالانہ آمدنی کا حساب کروں، اگرچہ بعض روایات میں اس کی بڑی مقدار بیان کی گئی ہے۔ فدک کی مادی قیمت پر چند امور دلالت کرتے ہیں:

(۱) ——— عمر نے ابوبکرؓ کو فدک کی واپسی سے یہ کہہ کر منع کیا کہ اگر فدک نکل گیا تو اسلام کی آمدنی کم ہو جائے گی حالانکہ جہاد مرتدین و عاصیین کے لیے اس وقت بڑی ثروت کی ضرورت ہے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ زمین جس کے حاصلات سے حکومت کا

---

[1] سیرۃ حلبی ج ۳ صفحہ ۴۰۰

معیار بلند کیا جا سکے اور سخت اوقات میں فوجوں کی تشکیل دی جا سکے۔ وہ کوئی معمولی باغ نہ ہوگا۔

(۲) ——— خلیفۂ وقت نے صدیقۂ طاہرہؑ سے گفتگو کے دوران میں یہ کہا تھا کہ مالِ خاصِ نبی اکرمؐ نہیں ہے بلکہ مالِ مسلمین تھا جس سے پیغمبرؐ لشکر سازی کیا کرتے تھے اور اسے راہِ خدا میں صرف کیا کرتے تھے۔ اہلِ انصاف بتائیں کیا یہ کام معمولی زمین سے لیا جا سکتا ہے؟

(۳) ——— تاریخ شاہد ہے کہ معاویہ نے فدک کو تین حصوں پر تقسیم کر دیا تھا۔ واضح بات ہے کہ معمولی زمین کی آمدنی تین بڑے سرمایہ داروں پر تقسیم نہیں کی جا سکتی۔

(۴) ——— معجم البلدان نے فدک کو قریہ سے تعبیر کیا ہے اور ابن ابی الحدید نے اس کے درختانِ خرمہ کو کوفہ کے چھٹی صدی ہجری کے خرموں کے برابر تحریر کیا ہے۔

۱؎ سیرۃ حلبی ۳ ص ۳۹۹

(۳)

تاریخ انقلاب

تاریخی بحث کے قوانین و قواعد

اگر نتیجہ خیز فکری حیات اور بامعنی منطقی بحث کے لیے ذاتی عقائد سے تجرّد، سنجیدگی حکم، اور حریتِ فکر ضروری اشیا ہیں تو پھر اسلاف کے کارناموں کی تاریخی بنیاد قائم کرنے کے لیے بھی ان اشیا کی اشد ضرورت ہوگی تاکہ ان کی حیات کے وہ خدوخال نمایاں ہو سکیں کہ جو تاریخ کی ملکیت بن کر رہ گئے ہیں اور ان کی شخصیت کے وہ عناصر سامنے آسکیں جو ان میں تھے یا جنھیں زمانہ نے ان میں محسوس کیا اور اس طرح گزشتہ ادوار کے لیے انسانی فکر و تامل کا میدان وسیع ہو سکے۔

اور یوں انسان اسلاف کی حیات کو دینی، اخلاقی اور سیاسی معیار پر پرکھ سکے، بشرطیکہ اس تامل و فکر کا منبع انسان کا واقعی معاشرہ ہو نہ کہ ذاتی عقائد و خیالات اور آبائی تقلید و تعبد، کہ اس طرح انسان چند اوہام پر تحقیق کی پوری عمارت قائم کر دیتا ہے جس کا دوام چند ساعت کے لیے بھی نہیں ہوتا۔

لیکن اگر ہم تاریخ پر گہری نظر ڈالیں، نہ اس لیے کہ ہم واقعات کا مطالعہ

کریں اور نہ اس لیے کہ اپنی بحث کو چند علمی قواعد میں محدود کر دیں اور نہ اس لیے کہ ہر واقعہ کے مفروضات و احتمالات کو جمع کر کے ان کی تصحیح و تغلیط کریں بلکہ اس لیے کہ ہم اسلاف کے کارناموں سے اپنے احساسات و جذبات کو زندہ کریں تو اس حالت میں یہ ان لوگوں کی تاریخ نہ ہوگی جو روئے زمین پر چند خاص احساسات و تصورات کے ساتھ زندہ رہے اور اچھے یا بُرے کردار کو پیش کر کے دنیا سے اُٹھ گئے۔

بلکہ یہ ان شخصیتوں کی سوانح نگاری ہوگی کہ جنھوں نے ہمارے اذہان میں زندگی کی ہے اور جن کے خیالات نے ہمیں افکار کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔

پس اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ فکری آزادی حاصل کرے اور دنیا کی تاریخ مرتب کرے، نہ روایاتی حیثیت سے کہ جو ذہن میں آئے اسے تحریر کر دے بلکہ حقیقت بیانی کے لحاظ سے، تو اسے چاہیے کہ اپنے ذاتی عقائد کو الگ کر دے اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو کم از کم تاریخی بحثوں سے ان کو الگ رکھے۔ اس لیے کہ عقائد انسان کی ذاتی ملکیت ہیں انھیں کوئی سلب نہیں کر سکتا۔

حقیقت بیانی خود اس امر کی طالب ہے کہ امانت و دیانت سے کام لیا جائے اور تاریخ انسانیت صحیح فکر کے ساتھ نتیجہ خیز انداز سے مرتب کی جائے

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ذاتی عقائد مورخین کو نقد و نظر سے روک دیتے ہیں چنانچہ مورخین کل یا اکثر کی یہ عادت ہوگئی ہے کہ وہ واقعات چند خاص قواعد کے ساتھ لکھ دیتے ہیں اور اس طرح حقائق وہ شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ ان میں وقتی حُسن نظر آنے لگتا ہے لیکن حقیقتاً ان وقائع کو دنیائے انسانیت کے نشاط و ارتقا سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔

عنقریب ہم ان باتوں کے شواہد اس عصر کے حالات سے پیش کریں گے کہ جو

تاریخ اسلام کا انتہائی پُرآشوب دور ہے اور وہ بعد وفاتِ نبیؐ کا وہ زمانہ ہے کہ جس وقت اسلام کا بنیادی مسئلہ ایک ایسی شکل میں حل ہو رہا تھا کہ جو ناقابلِ تغیّر و تبدّل ہو یعنی مسئلہ خلافت و ریاستِ امورِ مسلمین۔

صدرِ اسلام کی عظمت اور جوازِ تنقید

ہر مسلمان کی خواہش ہے کہ عصرِ اوّل کی تاریخ انتہائی پاکیزہ ہو۔ اس میں حیاتِ انسانی کے ساتھ شر و فساد کا اختلاط نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ اس دور میں خیر کے نمونے بکثرت موجود تھے۔

اس دور کا موجد ایک انسان اکبر تھا جس نے حیاتِ انسانیت کے مخفی پہلوؤں کو اجاگر کر دیا اور جس کے دور میں عقیدۂ الوہیت اس منزل تک پہنچ گیا تھا جہاں تک فلاسفۂ الٰہیات کے طائرِ اوہام پر نہیں مار سکتے تھے۔

جب نبی اکرمؐ کا روحانی عکس عصرِ اوّل پر پڑا تو اسے پیغمبری سانچے میں ڈھلنا ہی چاہیے تھا۔ چنانچہ محمدیین کی ایک جماعت تو اس طرح اس سانچے میں ڈھل گئی کہ ان کے اذہان میں سوائے تصورِ رسالت اور کوئی خیال ہی نہ رہا۔

وہی ان کے وجود کا مبدا اور وہی ان کا استادِ اکبر تھا، جس نے اپنی ذات کو الوہیت میں اس طرح فنا کر دیا تھا کہ وقتِ نزولِ وحی، سوائے صوتِ الٰہی کوئی آواز نہ سنتا تھا۔ اس کی نظر میں چاردانگِ عالم میں سوائے جلوۂ وحدت اور کچھ نہ تھا۔

وہ زمانہ جب مادی امتیازات کے موازین لغو قرار دے دیے گئے ہوں اور قانون کی نظر میں حاکم و محکوم برابر ہو گئے ہوں، جب کہ معیار، قیمتِ معنوی اور مدارِ کرامت، تقویٰ الٰہی کو قرار دے دیا گیا ہو، جس سے ارواح کی پاکیزگی اور خیر کی حفاظت ہوتی ہو جو نفسِ انسان کو آفاقِ عالیہ تک پہنچا دے، جس کے قوانین میں غنی کا احترام

بوجہ سرمایہ اور فقیر کی توہین بوجہ غربت حرام ہو۔ جس نے انسان کو بقدر عمل اہمیت دی ہو۔

" لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ "

وہ زمانہ تھا جس میں انسانیت کی فلاح کے لیے جہاد ہو رہے تھے تاکہ شخصی شرافتوں کو لغو قرار دیا جائے اور دنیاوی کرامتوں کو حساب سے ساقط کر دیا جائے۔

میرا خیال ہے کہ وہ زمانہ جو ان مفاخر و کرامات کا مجمع ہو حقیقتاً اس امر کا مستحق تھا کہ اس کی تقدیس اور اس کا احترام کیا جاتا۔

لیکن افسوس کہ مجھے کوئی طاقت اس امر پر مجبور کر رہی ہے کہ ایک ایسے موضوع کو وسعت دوں جو مجھ سے متعلق نہیں ہے۔ بہرحال میں اپنے موضوع کا خیال رکھتے ہوئے چاہتا ہوں کہ مختصر حالات اس زمانہ کے متعلق بیان کر دوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ زمانہ روحانیت اور نورانیت کے اعتبار سے قابل فخر تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کا باقاعدہ مطالعہ نہ کیا جائے اور اس زمانہ کے کسی مسئلہ پر صحیح طریقہ سے بحث و تمحیص نہ کی جائے۔

یا یہ نہ کہا جائے کہ مسئلہ فدک میں ایک نہ ایک خطا پر ضرور تھا۔ یا یہ رائے نہ قائم کی جائے کہ خلافت سقیفہ وقتی چارہ جوئی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ قدیمی سازش کا اثر ہے۔ خواہ تاریخ ان تمام باتوں کا ثبوت ہی کیوں نہ پیش کر دے۔ لا واللہ۔

ایک جماعت کا خیال ہے کہ گزشتہ زمانہ یعنی ابوبکر و عمر اور ان کے امثال کے کارناموں پر تنقیدی نظر نہیں ڈالنی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ لوگ حیات اسلامیہ کے ذمہ دار اور اسلامی سنہری شاہراہوں کے بانی تھے۔ ان کی تاریخ پر کسی قسم کا اعتراض کرنا اسلامی تاریخ کو بدنما بنانا ہے اور اس دور سے متعلق مسلمانوں کے

جذبات کو ٹھیس لگانا ہے۔

میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک مختصر کلمہ کہہ دوں کہ جو ایک طویل بحث کی بنیاد ہے۔ اس لیے کہ اس مسئلہ کو طول دینا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

میں ان مورخین سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ اسلامی وقار، یہ عصر اوّل کی نورانیت، یہ صدر اسلام کی روحانیت کیا صرف ابوبکر و عمر کے وجود کا نتیجہ ہے؟ کیا ان کو ان روحانیتوں میں کوئی مدخلیت حاصل ہے؟

اس کا تفصیلی حل تو طوالت طلب ہے۔

البتہ مختصر یہ ہے کہ اس عصر کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں دینی حمایت اور عقیدہ پر لڑ مرنے کا جذبہ آخری منزل پر تھا۔ یہاں تک کہ تاریخ بیان کرتی ہے کہ ایک روز عمر نے منبر پر پوچھ لیا کہ اگر ہم معروف کو منکر بنا دیں تو تم کیا کرو گے؟

ایک شخص بول اٹھا:

"ہم تم کو توبہ کا حکم دیں گے۔ اگر توبہ کرو گے تو قبول کر لی جائے گی۔"

عمر نے کہا: "اگر نہ کریں تو؟"

وہ بولا: "تمھاری گردن اڑا دیں گے۔"

عمر نے کہا: "شکر ہے اس معبود کا کہ جس نے امت میں ایسے افراد پیدا کر دیے جو ہماری غلطیوں[1] کی اصلاح کر سکتے ہیں۔

---

[1] اس جذبہ کا واضح ثبوت وہ واقعہ ہے کہ جب حضرت عمر نے برسر منبر عورتوں کے مہر کی حد بندی کی۔ اور ایک عورت نے اٹھ کر ٹوک دیا اور اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ عورتیں بھی احکام الٰہیہ سے واقف ہوتی ہیں اور انھیں بھی خلیفۃ المسلمین کی اصلاح کرنے کا حق حاصل ہے۔

یہ بھی یقینی امر ہے کہ حزبِ اختلاف یعنی اصحابِ علیؑ، خلافتِ وقت کی پوری نگرانی کر رہے تھے کہ اگر کوئی بات جادۂ حق سے منحرف واقع ہو تو خلافت کا تختہ الٹ کر رکھ دیں، جیسا انجام کہ عثمان کا ہوا جب انھوں نے مظالم شروع کر دیے۔ حالانکہ اب لوگ بہ نسبت زمانۂ شیخین کے کافی سست پڑ چکے تھے۔

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخین ایک ایسے زمانہ میں تھے کہ جس میں قوانین سیاست میں اگر کوئی تغیر کرنا چاہتا تو مشکل تھا، اس لیے کہ نظر اسلامی ان کی باقاعدہ نگرانی کر رہی تھی اور مسلمان اس وقت تک اسلام سے کافی خلوص رکھتے تھے اور ان میں حکومت کا کافی شوق تھا اور یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اگر اسلام میں کوئی واضح تغیر پیدا کر دیا تو حزبِ مخالف جو کہ پیغمبری سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور جس کا راہنما وارثِ رسولؐ وصیِ پیغمبرؐ ولی المومنین علیؑ ہے مقابلہ کے لیے کھڑا ہو جائے گا۔

اگرچہ فتوحاتِ اسلامیہ کو اس دور کے وقائع میں بطور سرخی نقل کیا جاتا ہے لیکن یہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کو حکومتِ وقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے کہ ہر جنگ مجاہدین امت کی طبعی شرافتوں کا پتہ دیتی ہے اور میدانِ جہاد سے صرف مجاہدین کی شخصیت کی تاریخ مرتب کی جاتی ہے نہ کہ اس حاکم کی جس تک آتشِ جنگ کی چنگاری تک نہیں پہنچی اور جس کی کوئی مستقل رائے اس سلسلہ میں نہ تھی۔

اس لیے کہ خلیفۂ وقت نے خواہ جنگ شام میں ہو یا عراق میں یا مصر میں، کسی وقت بھی کوئی کلمہ اپنی شخصی طاقت یا اپنی حکومت کے زور پر زبان سے نہیں نکالا کہ اس کلمے کو اہمیت دی جا سکے بلکہ ہمیشہ کلماتِ رسالت کی قوت کا اعلان کیا جس میں قطعی وعدہ تھا کہ بلادِ کسریٰ و قیصر فتح ہوں گے۔

اس کلامِ نبی کریمؐ سے مسلمانوں کی امیدیں بڑھ گئیں اور ان میں جوششِ ایمانی پیدا ہو گیا۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ بہت سے وہ لوگ جو بعدِ رسولؐ خانہ نشین ہو گئے تھے وہ گھر سے نہیں نکلے جب تک یہ نہ سن لیا کہ پیغمبرؐ نے فتح بلاد کسریٰ و قیصر کی خبر دی ہے بس یہی خبرِ رسولؐ اور قوتِ ایمانی تھی جو مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں روکے ہوئے تھی۔

اس کے علاوہ ایک بات اور تھی جس نے مسلمانوں کو کامیاب بنایا اور ان کو ہر معرکہ جہاد میں مظفر و منصور قرار دیا جس کا کوئی تعلق حکومتِ شوریٰ وغیرہ سے نہیں ہے اور وہ رسولؐ کا وہ اعلانِ توحید تھا جو آفاق میں گونج رہا تھا۔

مسلمان دیکھ رہے تھے کہ ہم جس ملک میں مادی قوت لے کر جاتے ہیں وہاں ایک روحانی لشکر بھی ساتھ ساتھ رہتا ہے اور یہ بات ہمت افزائی کے لیے بہترین وسیلہ ہے۔

ان فتوحات میں حاکمین کا فریضہ عینی یہ تھا کہ مسلمانوں کے ملک کو فتح کرنے کے بعد ان میں اسلامی روح پھونکیں، ان کے سامنے قرآنی نمونے پیش کریں، ان کے دل کی گہرائیوں میں دینی و مذہبی شعور اتار دیں۔

لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ ان حکام نے اپنے اس فریضہ کو کس طرح انجام دیا۔ اب مورخین مجھے بتائیں کہ میں اس سلسلے میں کوئی منظر پیش کروں یا پھر بعض مورخین کی طرح پورا پورا شک کروں جیسا کہ تاریخ بھی گواہی دیتی ہے۔

دونوں خلافتوں میں حالات ایسے تھے کہ نتیجہ خیز لشکری زندگی کی بنیاد ڈالتے اور سیاسی زندگی کی صحیح تعبیر کرتے؟

پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ لوگ کیا کرتے اگر علیؑ کی جگہ پر ہوتے اور علیؑ کو وہ دور مل جاتا جب کہ حیاء حالات نئی حکومت اور جدید سیاست تازہ زندگی

ؔ قوتِ ایمانی اور ثباتِ قدم کے اسی ارتباط و اتحاد کو جناب امیرؑ نے میدان جنگ میں اکفر بعد الایمان کہہ کر واضح کیا تھا۔ (مترجم)

اور لطفِ حیات کے لیے سازگار تھے۔ کیا یہ لوگ حالات کو اس طرح بدل سکتے تھے جیسے علیؑ نے زمانہ کو بدل کر اخلاص و عمل کی ایک مثال قائم کر دی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ شیخین اچھی سیرت اختیار کرنے پر مجبور تھے اور اعتدالِ حکومت ان کے لیے اضطراری امر تھا بلکہ میرا مقصد تو یہ ہے کہ حالات انھیں ان امور پر سختی سے آمادہ کر رہے تھے خواہ وہ خود راغب ہوں یا نہ ہوں۔

میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ان کے نام کو تاریخِ اسلامی سے علیحدہ کر دوں۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ سقیفہ کی اسلامی تاریخ کی بنیاد انھیں سے پڑی ہے۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی وقار، دینی روحانیت جو کہ صدرِ اوّل میں تھی اس میں ان کا ہاتھ برائے نام تھا۔

عقاد کی کتاب "فاطمہ و فاطمیون" اور ہم

اس وقت میرے پیشِ نظر عباس محمود عقاد کی کتاب "فاطمہ و فاطمیون" ہے میں نے اس کتاب کو بڑے شوق سے کھولا ہے تاکہ اس موضوع پر ان کی رائے کا مطالعہ کروں۔

اس وقت میرے ذہن میں یہ بات ہے کہ باپ دادا کی تقلید اور ان کے غلط کارناموں کی تاویل کا زمانہ گزر گیا ہے۔ اب وہ دور نہیں رہا جب مسائلِ انسانیت (خواہ وہ دینی ہوں یا تاریخی) میں غور و خوض کرنے سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ کہ جس پرہیز کی ابتدا خلیفۂ اوّل سے ہوئی جب کہ ان سے مسئلۂ قدر کے متعلق پوچھا گیا۔ تو انھوں نے سائل کو تہدید و تخویف شروع کر دی۔

بنابریں میری دلی امید تھی کہ

استاد موصوف کی کتاب سے اس بحث میں بہت کچھ لطیف مطالب حاصل ہوں گے۔ لیکن افسوس کہ واقعہ اس کے خلاف نکلا اور کتاب میں اس

موضوع کے متعلق صرف چند سطریں نکلیں، جن کو میں بعینہٖ نقل کر سکتا ہوں۔ جن کا ماحصل یہ ہے :

"مسئلۂ فدک کی بحث ان ابحاث میں سے ہے کہ جو کسی متفق علیہ نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صدیقہ کسی ایسے امر کا مطالبہ نہیں کر سکتی جو اس کا حق نہ ہو اور صدیق بھی کسی کے حق کو روک نہیں سکتے اگر بیّنہ قائم ہو جائے۔

یہ خیال انتہائی غیر مناسب ہے کہ ابو بکر نے فدک لے لیا تا کہ علیؑ اس کے حاصلات کو اپنی خلافت کے لیے نہ صرف کریں۔ اس لیے کہ ابا بکر و عمر و عثمان و علیؑ سب نے حکومت کی لیکن آج تک یہ نہیں سنا گیا کہ کسی نے دولت دے کر بیعت حاصل کی ہو۔ اس امر کا ذکر کسی بھی خبر و روایت میں نہیں ملتا۔ میری نظر میں صدیق کے عہد میں فدک سے بہتر پاکیزہ فیصلہ کسی مقدمہ میں نہیں ہوا۔ اس لیے کہ وہ فاطمہؑ کو فدک دے کر خوش کر سکتے تھے اور انھیں کی رضا سے صحابہ بھی خوش ہو جاتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، اس لیے کہ ایک فیصلہ کی ذمہ داری تھی جس کی بنا پر وہ اس قضیہ میں اس قدر مجبور ہو گئے۔ ورنہ یہ سب صادق و مصدق رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔"

اس مقام پر سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ استاد عقاد کی خواہش ہے کہ مسئلہ فدک ان مسائل میں سے قرار دیں جنھیں کوئی قرار نہیں اور جن

ہیں کوئی فیصلہ غیر ممکن ہے "تاکہ یہ بات کوتاہی بحث کا عذر بن سکے ۔

اس کا جواب تو آئندہ معلوم ہو جائے گا۔ اس وقت تو صرف یہ بتانا ہے کہ اگر بحث فدک کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی تو پھر یہ دو ناقابل انکار حقیقتیں کہاں سے پیدا ہو گئیں ۔

ایک یہ کہ صدیقہ نا حق مطالبہ نہ کریں گی ،
اور دوسرے یہ کہ صدیق کسی کا حق نہ ماریں گے ۔

اور اگر صحابہ کے کردار پر کوئی بحث نہیں ہو سکتی تو بے قرار بحث اور بے نتیجہ نزاع شروع سے کیوں اٹھائی گئی ۔

میری رائے ہے کہ مصنف کو ہر موضوع میں اپنی آزاد رائے پیش کرنے کا حق ہے، بشرطیکہ اس پر کوئی دلیل رکھتا ہو ۔ اور بحث کے تمام اطراف پر حاوی ہو تاکہ کسی ایک طرف کو اختیار کر سکے ۔

لیکن اس کا کوئی مطلب نہیں ہے کہ مسئلہ کو محل بحث تو قرار دیا جائے لیکن جو رائے پیش کی جائے وہ دلیل سے بالکل بے گانہ ہو۔ جو خود ہی محتاج شرح و تفسیر و غور و خوض ہو۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فاطمہ ؑ ناحق مطالبہ نہ کریں گی تو پھر مطالبہ بیّنہ کیسا! کیا اسلامی قوانین[1] قاضی کو اپنے علم کی بنا پر فیصلے سے روک دیتے ہیں ؟

اگر ایسا ہے تو کیا پھر کسی کے مال کا چھین لینا بھی اسلام میں اسی بنیاد پر جائز

---

[1] اسلامی قانون قضاوت میں یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ آیا قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کر سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اگر قاضی اس امر کو ناجائز بھی قرار دے دیں تو بھی حضرت ابوبکر کو فیصلہ کر دینا چاہیے تھا۔ ان میں اور دیگر قاضیوں میں تفرقہ کی تفصیل آئندہ واضح کی جائے گی ۔ (مترجم)

ہوجاتا ہے۔

یہ چند سوالات ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو علمی جواب کے طالب ہیں۔

میں چونکہ حریتِ فکر کا قائل ہوں اس لیے میں استاد عقاد کو بتانا چاہتا ہوں کہ صدیق و صدیقہ دونوں کے کردار کی اصلاح غیر ممکن ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ نزاع صرف اس بات پر ہوتی کہ صدیقہ باغ کا مطالبہ کریں اور صدیق منع کر دیں تو کہہ دیا جاتا کہ حقیقت میں فاطمہؑ صدیقہ ہیں لیکن مدرک شرعی کے مہیا نہ ہونے پر صدیق ان کو فدک دینے سے مجبور ہو گئے اس لیے کہ ممکن ہے کہ انسان کا واقعی حق نظامِ قضاوت کے قواعد کی بنا پر اسے نہ مل سکے۔

لیکن افسوس کی بات صرف اتنی نہیں بلکہ خصومت نے مختلف شکلیں پیدا کیں۔ یہاں تک کہ صدیقہ نے صراحتاً ابوبکر کو متہم کیا اور ان سے بے تعلقی کا عہد کر لیا۔

اس وقت ہمارے سامنے دو باتیں ہیں۔

ایک یہ کہ ہم اعتراف کر لیں کہ صدیقہ نے ایسے حق کا مطالبہ کیا کہ جو نظامِ شرعی اور قضاوتِ اسلامی کی رُو سے انھیں نہ ملنا چاہیے تھا اگرچہ واقعتاً وہ انھیں کا تھا۔

دوسرے یہ کہ اس کی ذمہ داری ابوبکر پر ڈال دیں کہ انھوں نے فاطمہؑ کا واجب الادا حق نہیں دیا۔ (ان دونوں باتوں کا فرق آئندہ واضح ہوگا)

پس یہ کہنا کہ فاطمہؑ حدود شرعیہ کے خلاف مطالبہ نہ کریں گی اور ابوبکر کسی کا حق نہ ماریں گے۔ ناقابلِ اجتماع باتیں ہیں جب تک کہ اجتماع ضدین ممکن نہ ہو جائے۔

یہاں پر ایک دوسرا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ استاد عقاد نے فاطمہؑ

کے خلاف فیصلہ کو خلیفہ کے ثبات قدم اور عدالت و استقامت کی دلیل قرار دیا ہے
اس لیے کہ اگر وہ فدک فاطمہؑ کو دے دیتے تو وہ بھی خوش ہوجاتیں اور صحابہ بھی خوش ہوجاتے۔

ہم نے مانا کہ حدود قانون اسلامی فدک کو صدقہ قرار دینے پر مجبور کر رہے تھے، تو کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اپنے اور اصحاب کے حصہ سے کچھ بنت رسولؐ کو دے دیا جاتا جبکہ صحابہ اس سے خوش تھے۔ بقول عقاد کیا قانون اسلام میں یہ بھی حرام تھا؟

یا کسی کا اشارہ تھا کہ فاطمہؑ کی اولاد بھوکی رہے۔ بلکہ وہ کون سا قانون تھا جو فدک دینے سے مانع تھا۔ جبکہ فاطمہؑ نے وعدہ کرلیا تھا کہ اس کے حاصلات کو مصالح مسلمین ہی پر صرف کریں گی۔ رہ گیا یہ مسئلہ کہ اگر فدک علیؑ کو ملتا تو وہ اس سے حکومت چلاتے جس کو عقاد نے وہم و خیال تصور کیا ہے تو اس کا تجزیہ ہم بعد میں کریں گے کہ آیا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے۔

طرفین کے موقف کی احساسی توجیہ و تعلیل

جب یہ معلوم ہوگیا کہ لوگوں کے ذاتی عقائد آسمانی وحی نہیں ہیں کہ جو ناقابل شک و انکار ہوں اور اسلاف کے کارناموں کی تنقید کفر و الحاد نہیں ہے جیسا کہ ایک جماعت کا خیال ہے تو پھر ہمیں یہ پوچھنے کا حق ہے کہ فاطمہؑ کو کس شے نے آمادہ کیا تھا کہ ایسی سختی کے ساتھ فدک کا مطالبہ کریں کہ گویا حکومت وقت اور سلطنت حاضرہ کی جلالت ان کی نظر میں کچھ ہے ہی نہیں کہ جو اس کے مظالم کی پردہ پوشی کرے بلکہ فیصلہ اتنا نمایاں ہوجائے کہ کوئی پردہ اس کو چھپا نہ سکے۔

بلکہ اس نزاع کی ابتدا اور اس کے مراحل تو یہ بتاتے ہیں کہ یہ نزاع

آخر تک پہنچتے پہنچتے ایک انقلاب کی شکل اختیار کرلے گی جس میں کسی ضعف و تردد کی گنجائش نہ ہو گی۔

عجب نہیں کہ حکومتِ وقت بلکہ خود خلیفہ کا یہ مقصد رہا ہو کہ فاطمہ زہراؑ کے ساتھ دو رنگی چال چلی جائے۔ لیکن یہ ان کے دل میں نہ آیا کہ اس طرح تاریخ میں ان کی بدعنوں کا ایک باب تیار ہو جائے گا جس میں ان کے اور اہلبیتِ رسالت کے جھگڑے نقل کیے جائیں گے تو پھر خلیفۂ وقت اس تاریخی باب کے موافق تھے کہ وہ فاطمہؑ کے خلاف اس جرأت و ہمت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

یا وہ واقعتاً قوانینِ قضاوت کے پابند تھے اور حدودِ الٰہیہ سے تجاوز کو جائز نہ جانتے تھے۔ جیسا کہ بعض کا خیال ہے یا اس موقفِ عجیب کو موقفِ سقیفہ سے بھی کوئی ارتباط حاصل ہے، ایسا اتحاد و ارتباط کہ جو دو مختلف چیزوں میں مقصد کی یگانگت اور غرض کی یکسانیت کی بنا پر ہوتا ہے۔

تحریکِ فاطمیہ کا دور یہ بتاتا ہے کہ وہ اہلِ بیت، وہ آلِ رسولؐ کہ جو اپنے عمیدِ اکبر کے انتقال سے محزون و رنجیدہ تھے، حالات سے اس قدر متاثر ہو گئے تھے کہ وہ حالاتِ حاضرہ کو بدلنے اور ان کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی اشد ضرورت محسوس کر رہے تھے اور اتفاقاً فاطمہ زہراؑ کے لیے انقلاب کے جملہ امکانات اور مقابلہ کی تمام قوتیں مہیا ہو گئی تھیں۔

جب ہم تاریخی وقائع کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو؛

ہمیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ نزاع اپنے واقعہ کے اعتبار سے حکومتِ وقت کے خلاف ایک انقلاب کی کوشش تھی۔ چونکہ اس نے اصولِ شریعت بدل کے رکھ دیے تھے۔ اس کا حقیقی تعلق ایک مالی سیاست سے نہیں ہے۔ اگرچہ اس کی ابتدا اقتصادی مسئلہ ہی سے ہوئی تھی۔ صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ دنیا، حکومت

وقت کی، دینِ نبی کریمؐ سے بے تعلقی کا بغور مطالعہ کرے۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ انقلابِ فاطمی کی اصل معلوم کریں تو ہمارا فرضِ اولین ہے کہ واقعہ کا بغور مطالعہ کریں تاکہ ہم پر تاریخِ اسلام کے دو واقعے جو ایک دوسرے کا عکس و اثر تھے واضح ہو جائیں۔

ان دونوں وقائع کا رشتہ درحقیقت ایک تھا جو کہ تھوڑے فاصلہ سے متحد ہو جاتا تھا۔

ان وقائع میں سے ایک فاطمی اقدام تھا کہ جس کی اہمیت یہ تھی کہ قریب تھا کہ ارکانِ حکومت کو متزلزل کر دے اور خلافتِ اولیٰ کو تاریخ میں جہلات کی جگہ دے دے۔

اور دوسرا عائشہ کا اقدام جس نے یہ چاہا تھا کہ زوجِ بتول علیؑ بن ابی طالب کی حکومت کی بنیادوں کو ہلا دے۔ مقدر ایسا تھا کہ دونوں اقدامات ناکام ہوئے لیکن ناکامیوں میں ذرا سا فرق تھا جو اقدام کرنے والے کی طبعی رضامندی سے وابستہ تھا اور اس کے اطمینانِ نفس اور جذبۂ نصرتِ حق کا پتہ دے رہا تھا۔

فاطمہؑ ناکام ہوئیں لیکن اس عالم میں کہ خلیفہ رو رو کر کہہ رہے تھے کہ مجھے خلافت سے مستعفی کرو۔

اور عائشہ ناکام ہوئیں اس عالم میں کہ وہ تمنا کرتی تھیں:

"کاش! گھر سے باہر نہ نکلتی اور مسلمانوں میں افتراق نہ پیدا کرتی۔"

یہ دونوں وہ انقلابات ہیں جو موضوع اور شخص کے اعتبار سے بہت قریب قریب ہیں تو پھر ایسا کیوں نہیں ہے کہ ان کے محرکات اور اسباب بھی ایک جیسے ہوں۔

ہم بخوبی واقف ہیں کہ وہ سبب انقلاب جس نے عائشہ کو گھر سے نکال دیا تھا اس وقت جبکہ انھوں نے خلافت علیؑ کی خبر پائی ان اوقات میں پیدا ہوا تھا جب حیاتِ نبی کریم میں زوجۂ رسولؐ اور بنتِ رسولؐ کے مقابلے چل رہے تھے ۔

اس مقابلہ کا انجام یہی ہونا تھا کہ اس میں وسعت پیدا ہو اور شکست خوردہ طرف کے دل میں غیظ و نفرت کے احساسات پیدا ہو جائیں ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ اس دائرہ میں وسعت پیدا ہو گئی ۔

ایک طرف اس طرح کہ عائشہ نے علیؑ کے خلاف مہم چلا دی اور دوسری طرف ایسی وسعت پیدا ہوئی جس میں اس شخصیت کو بھی لے لیا گیا کہ جس کی وجہ سے بیت النبیؐ میں علیؑ سے عداوت چل رہی تھی ۔

سچ تو یہ ہے کہ عائشہ کے انقلاب کی مہم اس وقت سے شروع ہو گئی تھی جب قصۂ افک میں علیؑ نے پیغمبرؐ کو طلاق کا مشورہ دیا تھا ۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ایک عورت کو کس قدر متاثر کر سکتی ہے ۔ جبکہ وہ پہلے سے اس کی زوجہ کی مخالف بھی ہو ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ زوجۂ رسولؐ اور بضعۃ النبیؐ کے درمیان نزاع اس حد تک بڑھی کہ اس میں علیؑ وغیر علیؑ کو بھی داخل کر لیا گیا ۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ

حالات خلیفۂ اول کو فاطمہؑ کی خاص نگرانی کی طرف متوجہ کر رہے تھے ۔ مزید برآں یہ کہ جب خلیفۂ اول نے فاطمہؑ سے عقد کا پیغام دیا تھا تو اسے پیغمبرؐ نے رد کر دیا تھا ۔ حالانکہ علیؑ کے پیغام کو قبول کر لیا تھا ۔

ظاہر ہے کہ یہ رد و قبول بھی ایک ایسے انسان میں کہ جس کے پہلو میں دل ہو اور دل میں احساس ، ایک غیظ یا حسد کا مادہ ضرور پیدا کر دے گا ۔ اور اس طرح شکست خوردہ انسان میں ایک مقابلہ کا جذبہ پیدا ہو جائے گا ۔

یہ بھی قابل توجہ امر ہے کہ رسولؐ نے ابوبکر کو سورۂ برأت دے کر بھیجا تاکہ کفار کو سنائیں اور اس کے بعد علیؑ کو بھیج کر نصف راہ سے واپس لے لیا۔ صرف اس بنا پر کہ فاطمہؑ کے بارے میں علیؑ سے مقابلہ کرنے والا اپنی استعدادِ ایمانی کا اندازہ کر لے۔

یہ بھی طبعی بات ہے کہ خلیفہ اس مقابلہ کو دیکھ کر بھی متاثر ہوئے ہوں گے کہ جو فاطمہؑ اور عائشہ کے درمیان پیغمبر اکرمؐ کی محبت کے سلسلے میں چل رہا تھا۔ جیسا کہ ایک باپ کا بیٹی کے متعلق خیال ہوتا ہے اور عجب نہیں کہ جس وقت مرض الموتِ نبی اکرمؐ میں عائشہ نے اپنے باپ کو نماز کے لیے بھیج دیا اور پھر خود پیغمبرؐ نے آکر ان کو معزول کر دیا، خلیفہ نے یہ خیال کیا ہو کہ یہ تحریک بھی فاطمہؑ کی ہے۔ انھوں نے میری امامت کو باطل کرنے کے لیے اپنے باپ کو بستر علالت سے اٹھا کر مسجد کی طرف روانہ کر دیا ہے۔

تاریخ سے یہ قطعی امید نہیں ہو سکتی کہ وہ واقعات کو مفصل و مبسوط طریقہ پر بیان کرے۔

البتہ جو بات کہ یقینی معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جس شخص پر ایسے ناکام حالات گزر چکے ہوں اس کا فطری تقاضہ یہ ہے کہ فدک میں فاطمہؑ کے مقابلہ میں سختی سے قیام کرے۔

اور وہ عورت جو فاطمہ زہراؑ کی طرح سے مصائب اٹھائے، یہاں تک کہ صبح و شام مخالف کی بیٹی کے حسد سے نجات نہ پا سکے، یقیناً اس امر کی مستحق ہے کہ وہ اس وقت خاموش نہ رہے کہ جب لوگ اس کے حق شرعی پر قابض ہو رہے ہوں۔

انقلاب کا سیاسی رنگ

یہ ہے تاریخ انقلابِ فاطمی جس میں مختلف پہلو اساسی نظر آتے ہیں لیکن واضح تر پہلو سیاست کا ہے جس کا اندازہ اطوار و اسالیبِ انقلاب سے ہوتا ہے۔

اس بات سے میری مراد وہ مفہوم نہیں ہے جو آجکل رائج ہے جس کی بنیاد جعل و فریب پر ہوتی ہے۔ بلکہ میرا مقصود وہ حقیقی مفہوم ہے جس میں افترار کی گنجائش نہیں ہے لہٰذا اگر کوئی شخص اس نزاع کے اشکال و اطوار کا مطالعہ کرے تو فوراً یہ خیال کرے گا کہ ــــــــــــ

اتنا بڑا اقدام ایک زمین کے مطالبہ کے لیے نہیں ہو سکتا بلکہ درپردہ کوئی اس سے بڑی مہم ہے جو انقلاب پر آمادہ کر رہی ہے، اس خاتون کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنی گئی ہوئی حکومت اور لٹے ہوئے تخت و تاج کو واپس لے لے۔

بنا بریں فدک ایک رمزی لفظ ہے جس سے بڑے اہم معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس سے مراد حجاز کا خطۂ ارضی نہیں ہے اور یہی فدک کی رمزیت تھی جس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، یہاں تک کہ وسیع میدانِ جنگ قائم ہو گیا۔

آپ جس طرح چاہیں تاریخ فدک کے حقائق کا مطالعہ کریں لیکن مجھے بتا دیں کہ یہ ایک مادی جھگڑا تھا ــــــــ؟

کیا یہ فدک کے محدود معنی میں نزاع ہو رہی تھی ــــــ؟

کیا یہ ایک مختصر زمین کے غلات کا مقابلہ تھا ــــ؟

ہرگز نہیں، طرفین نزاع کی شان اس سے اجل و ارفع ہے کہ ایسی نزاع قائم کریں بلکہ درحقیقت یہ اقدام اساسِ حکومت کے خلاف تھا، جس سے فاطمہؑ نے چاہا تھا کہ خلافت کی ان بنیادوں کو ہلا کر پھینک دیں جو ان کے شوہر

کے خلاف روزِ سقیفہ قائم کی گئی تھیں۔

اس امر کے اثبات کے لیے وہ خطبہ کافی ہے جو کہ فاطمہ زہراؑ نے مسجدِ رسولؐ میں خلیفہ کے سامنے پڑھا تھا جس وقت مسجد انصار و مہاجرین سے چھلک رہی تھی۔

اس خطبہ میں پہلے زہراؑ نے علیؑ کی مدح کی اور ان کی جنگوں کا تذکرہ کیا، حقوقِ اہلبیتِ رسالت بیان کیے کہ یہی مخلوقات کا وسیلہ ہیں، یہی حجج اللہ اور ورثۂ انبیاء ہیں۔

اس طرح فاطمہؑ نے لوگوں کو ان کی خطا، ان کے فوری انتخاب کی کمزوری اور ان کو ان کی بے دینی کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ اسباب بیان کر دیے کہ جن کی وجہ سے امت نے موضوع خلافت و امامت میں کتاب و سنت کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

اب معلوم ہو گیا کہ یہ مسئلۂ میراث و عطیہ نہیں ہے مگر اس مقدار تک کہ جہاں تک اس کا تعلق حکومتِ وقت سے ہے۔ اور یہ مطالبہ کسی جائداد کا نہیں ہے بلکہ زہراؑ کی نگاہ میں یہ اسلام و کفر، ایمان و نفاق اور نص و اجماع کا مسئلہ ہے۔

یہی بلند سیاست اس گفتگو میں بھی نظر آتی ہے جو فاطمہؑ نے انصارؓ و مہاجرین کی عورتوں سے کی تھی۔

آپ نے فرمایا:

لوگوں نے ارکانِ رسالت، قواعدِ نبوت، مالک دنیا و دین کو چھوڑ کر خلافت نہ جانے کن لوگوں میں ڈال دی بھلا کون سا عیب علیؑ میں انھوں نے پایا۔ ہاں! یہ علیؑ کی تلوار، ان کے اقدامات، ان کے مجاہدات اور راہ خدا میں ان کی قربانیوں سے نالاں ہیں۔

اس کے بعد فرماتی ہیں :

ان لوگوں نے پست اقوام کو بلند لوگوں پر مقدم کر دیا ہے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کا یہ عمل اچھا ہے یاد رکھو! یہ لوگ فساد برپا کرتے ہیں اور انھیں خود شعور نہیں ہوتا حیف! یہ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ہدایت یافتہ انسان زیادہ مستحق اتباع ہوتا ہے یا وہ شخص جو خود ہی محتاج ہدایت ہو۔ نہایت ہی بدترین یہ فیصلہ ہے۔

ازواجِ رسولؐ سے کہیں نہیں نقل کیا گیا کہ انھوں نے بھی میراث کا مطالبہ کیا ہو۔ کیا یہ کہا جائے کہ یہ عورتیں فاطمہ زہراؑ سے زیادہ تارک دنیا تھیں؟ یا یہ تصور کیا جائے کہ یہ مذاقِ شریعت رسولؐ سے زیادہ واقف تھیں؟ یا یہ خیال کیا جائے کہ یہ مصیبتِ پیغمبرؐ میں مشغول ہو گئیں اور فاطمہؑ متوجہ نہیں ہوئیں۔

یا پھر یہ مان لیا جائے کہ حکومتِ وقت نے حالات میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ انھوں نے ازواج کو مطالبہ کا موقع ہی نہیں دیا اور فاطمہؑ کو اس امر پہ مجبور کر دیا کہ وہ شدید معارضہ اور سخت مقابلہ کریں جو تاریخ میں ابدی یادگار بن جائے۔

میرا تو یہ خیال ہے کہ

فاطمہؑ کی نظر میں شیعیانِ حیدر کرارؑ اور اصحابِ علیؑ میں ایسے افراد ضرور رہے ہوں گے جو فاطمہؑ کو سچا سمجھتے تھے اور ان کے ذریعے سے فاطمہؑ نصابِ شہادت کامل کر سکتی تھیں، لیکن فاطمہؑ کا یہ ذکر بتاتا ہے کہ ان کا مقصد صرف اثباتِ میراث و عطیہ نہ تھا بلکہ نتائج سقیفہ کے خلاف اقدام تھا اور وہ فدک میں اقامۂ شاہدین سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس امر پر شاہد جمع کرنے سے ہوگا کہ یہ لوگ حقیقی صراط مستقیم سے گمراہ ہو گئے ہیں اور یہی وہ باتیں تھیں جنھیں فاطمہ زہراؑ نے اپنے اقوال و اعمال سے نمایاں کر دیا۔

آیئے اب اس کے بعد خلیفہ کے کلمات سنیں۔ جب فاطمہ زہرا مسجد سے واپس چلی گئیں تو خلیفہ نے منبر پر جاکر یوں خطاب کیا:

"اے لوگو! تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ ہر بات سن لیتے ہو، انھیں تو یہ امیدیں عہد رسولؐ ہی سے تھیں جس نے سنا ہے وہ کہے، جو جانتا ہو وہ بولے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ (علیؑ) ایک لومڑی کے مانند ہے جس کی گواہ اس کی دُم ہو، وہ فتنوں کی آماجگاہ ہے۔ اس کی مثال اُم طحالؔ کی ہے جسے صرف اپنے چاہنے والوں سے محبت ہوتی ہے۔ یاد رکھو میں اگر چاہوں تو کہہ سکتا ہوں اور اگر کہوں گا تو کھل کر کہوں گا لیکن اس وقت مناسب نہیں ہے۔"

پھر انصار سے متوجہ ہو کر کہا:

"اے گروہ انصار! مجھے تمھارے بیوقوفوں کے کلمات کی اطلاع ملی ہے، تم عہد رسولؐ کی پابندی کے زیادہ حقدار تھے، لیکن جب وہ تمھارے پاس آئے تو تم نے انھیں پناہ دی اور ان کی نصرت کی یاد رکھو میں کسی غیر مستحق کو سزا دینا نہیں چاہتا۔"

اس کلام سے خلیفہ کی شخصیت کا فی الجملہ اندازہ ہوتا ہے اور فاطمی نزاع

لے زبان قلم لرزتی ہے کہ اس کلمہ کی شرح کس طرح کریں کہ جسے خلیفۂ وقت نے نہایت ہی آزادی کے ساتھ اپنی زبان پر جاری کیا۔ یاد رکھیے کہ ام طحال عرب کی ایک مشہور بدکار عورت کا نام ہے۔ تو پھر کیا اس جسارت کے بعد بھی شیعیانِ علیؑ پر یہ الزام باقی رہ جاتا ہے کہ وہ صحابہ کو برا بھلا کہتے ہیں؟ کیا حضرت علیؑ صحابہ میں نہیں ہیں؟ مترجم

پر کچھ روشنی پڑتی ہے ۔ اس وقت جو بات زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ خلیفہ نے بھی فاطمی مطالبہ سے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ صرف میراث وعطیہ کا مطالبہ نہیں ہے۔ اسی لیے انھوں نے روئے سخن علیؑ کی طرف موڑ دیا اور انھیں کی مذمت شروع کر دی۔ میراث کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ یہ باتیں اس امر پر روشنی ڈالتی ہیں کہ فاطمہؑ کا اقدام اس حق کے مطالبہ کے لیے تھا جو ان کے شوہر کو آسمان سے حاصل ہوا تھا اور جس کے وہ واقعی اہل تھے۔

اس کے علاوہ وہ روایت بھی قابل دید ہے کہ جو صحاح اہلسنت میں موجود ہے کہ علیؑ وعباسؓ میں عمر کے زمانہ میں فدک کے بارے میں جھگڑا ہوا - علیؑ کا دعویٰ تھا کہ رسولؐ نے فاطمہؑ کو ہبہ کر دیا تھا اور عباس اس کے منکر تھے ۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ملک رسولؐ ہے اور میں اس کا وارث ہوں۔ عمر کے پاس معاملہ پیش ہوا اور انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اپنے حالات تم بہتر سمجھتے ہو۔ میں نے تم دونوں کے حوالے کر دیا۔

اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفۂ اول کا حکم صرف وقتی سیاست کی بنا پر تھا ۔ ورنہ عمر بن الخطاب ان کی بیان کردہ حدیث پر ضرور عمل کرتے ۔ اور حالات یہ بتاتے ہیں کہ عمر نے دونوں کو فدک بطور میراث دیا تھا نہ بطور وکالت[1] ۔ ورنہ اگر ایسا ہوتا تو عمر کو بھی یہ فیصلہ کرنا چاہیے تھا کہ تم دونوں وکیل ہو۔ یہ نزاع بالکل بیکار ہے ۔ مزید برآں یہ کہ تنہا علیؑ کو نہ دینا یہ بتاتا ہے کہ عمر کو دعویٰ عطیہ کا بھی اعتبار نہ تھا ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فدک دونوں کو بطور میراث دیا گیا تھا اور بس۔

اب اس مسئلہ کی دو صورتیں ہو گئیں :

---

[1] وکالت کا تصور اس مقام پر اس طرح پیدا ہو سکتا تھا کہ حضرت عمر فدک کو مسلمانوں کا مال ہونے کی بنا پر حکومت کی زیر نگرانی رکھتے اور ان دونوں حضرات کو حکومت کی طرف سے اس کے انتظامات کا وکیل بنا دیتے۔ مترجم

(۱) ــــــــ عمرؓ، خلیفہ اوّل کو واضح حدیث سمجھتے تھے ۔
(۲) ــــــــ عمر حدیث کے ایسے معنی سمجھے جو کہ منافیٔ وراثت نہ تھے لیکن انھوں نے اسے بیان نہیں کیا۔

اب چاہے یہ احتمال صحیح ہو یا وہ ۔ لیکن سیاسی پہلو بالکل آشکار ہے ورنہ اگر مسئلہ سیاستِ وقت کے اعتبار سے حل نہ کیا جاتا تو عمرؓ، ابوبکر کو واضح حدیث کہتے یا تاویل کو مخفی نہ کرتے جبکہ انھوں نے اکثر مسائل میں رسول اسلامؐ اور ابوبکر کے روبرو ان کی تردید کی ہے ۔

جب ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ فاطمہؑ کا مطالبہ اس وقت شروع ہوا جب لوگ حکومت اسلامی کو غصب کر چکے تھے حالانکہ کسی شخص نے اپنی میراث خلیفہ سے طلب نہیں کی تو واضح ہو گیا کہ مطالبۂ میراث ایک بہانہ تھا اس اقدام کی ابتدا کا جو فاطمہؑ زہرا غاصبینِ خلافتِ نبیٔ اکرمؐ کے خلاف کرنا چاہتی تھیں اور جس سے اپنے شوہر کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہتی تھیں۔

جب کہ یہ واضح ہو گیا کہ فاطمہؑ نے اپنے حق کا مطالبہ غصبِ خلافت سے پہلے نہیں کیا تو معلوم ہو گیا کہ حالاتِ زمانہ فاطمہؑ کی پوری پوری حمایت کر رہے تھے کہ قصۂ میراث کو بہانہ قرار دے کر اٹھ کھڑی ہوں ، ــــــــــــــــ

ــــــــ اور امت کے سامنے ثابت کر دیں کہ وہ لوگ ہرگز مستحقِ خلافت نہیں ہو سکتے جو بنتِ رسولؐ کا حق غصب کر لیں اور قوانینِ شریعت کا استخفاف کریں ۔ فاطمہؑ ایسا نہ کرتیں تو آج حق و باطل کا امتیاز مٹ کر رہ جاتا ۔

حکومت میں جماعتی رنگ آمیزی

اگر ہم چاہیں کہ اس نزاع کا مطالعہ ان حالات کی روشنی میں کریں جن میں

یہ نزاع قائم ہوئی تو ضرورت اس امر کی ہوگی کہ مختصر طریقے سے اس عہدِ انقلابی کی تصویر کشی بھی کر دیں تاکہ اپنے موضوع سے خارج نہ ہونے پائیں۔

ہماری مراد اس انقلاب سے اس کے معنی حقیقی ہیں۔ اس لیے اس عہد میں قانونِ اسلام منقلب ہو گیا تھا۔ اور بجائے ملوکیت[1] ایسی جمہوریت قائم ہو گئی تھی جس کے تمام اختیارات اور صلاحیات عوام الناس کے ہاتھوں میں تھے۔ جب کہ پیغمبرؐ کی ساری استعداد ممنونِ احسانِ سماوی تھی۔

جس وقت کہ بشیر بن سعد نے خلیفہ کے ہاتھ پر ہاتھ مارا، اس وقت سے تاریخِ اسلامی میں ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا۔ اور اس دور جدید کے درمیان جس کا آغاز اب ہو رہا ہے، یہ حادثہ اس دن پیش آیا جب حیاتِ نبوت کی آخری ساعت ختم ہو رہی تھی۔ اور زمین و آسمان کے مقدس اور بابرکت رشتے منقطع ہو رہے تھے۔

جس وقت پیغمبرؐ کی آخری ساعتیں ختم ہوئیں اور ان کی روحِ اقدس ملاءِ اعلیٰ کی طرف پرواز کر کے "قابَ قوسین او ادنیٰ" کی منزلوں میں پہنچ گئی، لوگ اس بیت النبوۃ کی طرف متوجہ ہوئے کہ جس سے محمدی شعاعیں نکل رہی تھیں تاکہ عہدِ رسالت کو رخصت کریں اور اس نبوت کی تشییع کریں جو کلیدِ شرافتِ امتِ اسلامیہ اور سرِ عظمتِ دینِ اسلام تھی۔

لوگ بیتِ رسالت کی طرف اس عالم میں چلے کہ ان کے دلوں میں مختلف خیالات، متفرق احساسات تھے۔ ان کے افکار پر پیغمبرؐ کے تذکرے چھائے ہوئے تھے، جلالتِ رسالت کا پہرہ تھا۔ وہ یہ خیال کر رہے تھے کہ یہ دس سال جو نبوت

---

[1] یہ یاد رہے کہ اسلامی ملوکیت سے مراد آج کی شاہی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ سلطنت ہے کہ جس کا بادشاہ مالک الملوک ہے اور جس کے نظام زندگی میں بغیر حکم خدا کسی انسان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ مترجم

کے سایۂ رحمت میں گزارے ہیں شاید ایک خواب تھا جو چند لمحوں تک قائم رہا اور اس سے انسان اس عالم میں بیدار ہوا کہ چاروں طرف سے مصائب میں گھرا ہوا ہے۔

مسلمان اس بے پناہ شدت اور ہولناک خاموشی کے عالم میں تھے کہ کسی کی زبان سے کوئی کلمہ نہ نکلتا تھا بلکہ ہر شخص اپنے آنسوؤں اور حسرتوں سے بیتِ رسالت کو پرسا دے رہا تھا کہ ایک دفعہ ایک آواز سنائی دی جس نے فضاؤں میں ہلچل ڈال دی۔ اور خاموشی کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

وہ آواز یہ تھی کہ:

"محمدؐ کا انتقال نہیں ہوا، اور جب تک دینِ اسلام عالم پر غالب نہ آجائے وہ نہیں مر سکتے۔ عنقریب پلٹ کر آئیں گے اور جس نے ان کی موت کا اعلان کیا ہے اس کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالیں گے۔ میں جسے یہ کہتا سنوں گا کہ محمدؐ مر گئے اس کی گردن اُڑا دوں گا۔"

ساری نظریں اس مرکز کی طرف متوجہ ہو گئیں کہ دیکھیں کہ آخر یہ کس کی صدا ہے!

دفعتاً دیکھا کہ عمر بن الخطاب خطبہ دے رہے ہیں اور ان کی رائے میں اتنی شدت ہے کہ جو کسی تذبذب کے قابل نہیں۔ اب لوگوں میں خبرِ حیات النبیؐ دوبارہ نشر ہو گئی اور اس موضوع پر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ رائے اکثر لوگوں کی نظر میں عجیب و غریب معلوم ہوئی ہو گی بلکہ بعض لوگوں نے تکذیب کا قصد بھی کیا ہو گا لیکن کہنے والے کا اپنے قول پر اٹل رہنا اس بات سے مانع ہو گیا ہو گا اور لوگوں نے جمع ہو کر اس قول پر تبصرہ ضرور شروع کر دیا ہو گا۔ یہاں تک کہ ابو بکر آ گئے جو کہ اس وقت اپنے مکان قریہ سخ میں تھے انھوں

نے آتے ہی کہہ دیا :

" ایہا الناس ! جو محمدؐ کی عبادت کرتا تھا وہ سمجھ لے
کہ محمدؐ مر گئے اور جو اللہ کا بندہ تھا اس کا خدا زندہ ہے قرآن
کہتا ہے کہ پیغمبرؐ تمھیں بھی ایک دن مرنا ہے۔ اگر پیغمبرؐ دنیا سے
اٹھ گیا تو کیا تم لوگ کافر ہو جاؤ گے ؟ "

ادھر عمر نے یہ آواز سنی اور انھیں وفاتِ پیغمبرؐ کا یقین ہو گیا۔ وہ کہنے لگے۔ میں نے پہلے یہ آیت سنی ہی نہ تھی۔

میری نظر میں وہ لوگ جو اس واقعہ کو ابو بکر کی شجاعت اور ان کی شوکتِ خلافت کی دلیل سمجھتے ہیں قطعاً خطا پر ہیں۔ اس لیے کہ عمر کو ٹوک دینا کوئی بڑی بات نہ تھی، جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ اس وہم میں عمر کا کوئی شریک نہ تھا۔ بلکہ یہ ان کی ذاتی رائے تھی۔

اس بحث کا لازمہ یہ ہے کہ میں اس بات کی تحقیق کروں کہ خلیفۂ وقت کا وہ خطاب جو لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا وہ ایک بے ربط کلام تھا جس کو مسلمانوں کے تڑپتے ہوئے احساسات سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بلکہ انھوں نے تو بیان حادثہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا کہ محمدؐ کے عابد سمجھ لیں کہ محمدؐ مر گئے۔ حالانکہ ایسے موقع پر ابو بکر سے یہ امید تھی کہ وہ مرنے والے کا پرسا دیں گے اور ان جذبات و حسرات کا خیال کریں گے جو مسلمانوں کے دلوں میں بھڑک رہے ہیں۔

بھلا وہ کون سا انسان تھا کہ جو سید الانبیاءؐ کی عبادت کرتا تھا کہ جس سے کہا جائے کہ تمھارا معبود مر گیا۔ کیا کلام عمر کے کسی لفظ سے یہ خیال کیا گیا کہ وہ عابدِ محمدؐ تھے؟ یا ارتداد و الحاد کی لہریں اس اجتماعِ مومنین میں دوڑ رہی تھیں کہ جو چند ساعت قبل تک رسولؐ کے سایۂ رحمت میں پرورش پا رہا تھا اور جس کے آنسو وفاتِ پیغمبرؐ

پر مسلسل بہہ رہے تھے۔

اب واضح ہوگیا کہ ابوبکر کے خطاب کو نزاکت وقت اور اعلانِ عمر سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور نہ اسے اسلامی جذبات ہی سے کوئی تعلق تھا۔

اسی اجتماع کے مقابلہ میں ایک دوسرا اجتماع انصار کا سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا جس کی ریاست رئیس خزرج سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں تھی۔ وہاں لوگوں کو حکومتِ اسلامی قائم کرنے کے لیے بلایا گیا اور یہ بحث شروع ہوگئی کہ اگر مہاجرین نے انکار کر دیا تو کیا ہوگا اور اپنی قرابت کا واسطہ دیا تو ہم کیا کریں گے۔

ایک شخص بول اٹھا، ایک امیر ہم میں سے ہوگا ایک ان میں سے۔

سعد نے کہا۔ یہ پہلی کمزوری ہے۔

جب عمر کو یہ خبر ملی تو خانۂ رسولؐ اکرم تک آئے جہاں ابوبکر تھے، آدمی بھیج کر انھیں بلایا۔ انھوں نے عذر کیا۔ دوبارہ طلب کیا اور واقعہ کی اہمیت کا واسطہ دیا۔ وہ نکلے تو انھیں اطلاع دی۔ اور دونوں دوڑتے ہوئے سقیفہ کی طرف چلے۔ ان کے ساتھ ابوعبیدہ بھی تھے۔

ابوبکر نے پہنچتے ہی مہاجرین کی قرابت کا ذکر شروع کر دیا اور بولے ہم امیر اور تم وزیر ہو۔ تم سے رائے مشورہ کرتے رہیں گے۔

حباب بن منذر نے کھڑے ہو کر کہا

"اے انصار! اپنے امیر کی حفاظت کرو۔ لوگ تمھارے زیرِ سایۂ عطوفت ہیں، کسی میں تمھاری مخالفت کی جرأت نہیں ہے تم اہل عزت و شرافت و عدد و کثرت ہو، تم صاحب رعب و کرامت ہو۔ اگر یہ نہ مانیں تو ہم میں سے بھی امیر ہو اور ان میں سے بھی"

عمر بول اٹھے: ایک نیام میں دو تلواریں نہیں ہو سکتیں عرب

اس امر سے خوش نہیں کہ تم کو امیر بنائیں جبکہ رسول ص تم میں سے نہیں۔ لیکن عرب ہمیں امیر مان لیں گے چونکہ ہم اقربا و اولیاء رسول اکرم ص ہیں۔

حباب نے دوبارہ تاکید کی۔

اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھو، ایسی باتیں مت سنو، ورنہ تمھارا حق ضائع ہو جائے گا۔ تمھاری تلواروں سے دین کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔ میں ان باتوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ تم اگر میرا ساتھ دو تو تمام کام درست ہو جائے گا۔

عمر نے کہا:

"اللہ تجھے ہلاک کر دے گا۔"

وہ بولا: "تجھے قتل کر دے گا۔"

ابو عبیدہ نے کہا:

"گروہ انصار! تم نے شروع سے پیغمبر کی مدد کی، اب چاہتے ہو کہ دین نبی ص میں تغیر پیدا کر دو۔"

بشیر بن سعد کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

"اے انصار! محمد ص قریش سے ہیں اور وہ زیادہ مستحق ہیں۔ میں اس امر پر نزاع نہیں کر سکتا۔"

ابو بکر نے کہا: "یہ عمر اور ابو عبیدہ ہیں، کسی ایک کی بیعت کر لو۔"

وہ دونوں بولے: ہم اس کے اہل نہیں، آپ افضل المہاجرین اور نماز میں خلیفۂ رسول ص ہیں آپ ہاتھ پھیلایئے۔

انھوں نے ہاتھ بڑھا دیا۔ بشیر بن سعد نے بڑھ کر بیعت کر لی۔

حباب نے آواز دی: "اے بشیر! تو اپنے ابن عم سے حسد کرتا ہے۔"

اسید بن حضیر بولا: اچھا ہوا، ورنہ اگر سعد کی بیعت ہو جاتی تو خزرج کو

اوس پر دائمی فضیلت مل جاتی۔

سب نے ابوبکر کی بیعت کر لی اور چاروں طرف سے لوگ برائے بیعت آنے لگے[1] ـــــــ اس قصّہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عمر نے سقیفہ کی خبر سنی اور پھر ابوبکر کو اطلاع دی۔ اس کا تعلق کسی وحیٔ سماوی سے نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ابوبکر کے آنے کے بعد میتِ رسولؐ کو چھوڑ دیا۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کیا؟

اور یہ خبر صرف ابوبکر کو کیوں دی؟

ان امور کی کوئی معقول وجہ علاوہ اس کے نظر نہیں آتی کہ تینوں میں پہلے سے کچھ سازباز تھی۔ اس امر کے تاریخ میں حسبِ ذیل شواہد ملتے ہیں:

(۱) ـــــــ عمر نے سقیفہ کی اطلاع صرف ابوبکر کو دی اور باوجود عذر کرنے کے انھیں آنے پر مجبور کیا۔ یہاں تک کہ جب غرض بیان کر دی تو دونوں دوڑ کر وہاں پہنچ گئے۔ اگرچہ یہ ممکن تھا کہ جب انھوں نے عذر کیا تھا تو دوسرے مہاجرین کو بلا لیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ اس حرص و طمع کی علت دوستی کو نہیں قرار دیا جا سکتا اس لیے کہ مسئلہ دوستی کا نہ تھا اور پھر مہاجرین کے استحقاق کا دار و مدار عمر کے دوستوں پر نہ تھا بلکہ ہر وہ شخص اس کام کے لیے کافی تھا جو اس امر میں ان کا ساتھ دے سکے۔ یہ بھی ناقابلِ فراموش بات ہے کہ عمر خود ابوبکر کو بلانے نہیں گئے بلکہ آدمی بھیج کر بلایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خبر منتشر ہو جائے اور بنی ہاشم اس امر پر مطلع ہو جائیں۔ اپنے قاصد سے یہ بھی کہہ دیا

[1] جز اول، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی ص ۱۲۷ و ص ۱۲۸

کہ ایک کام درپیش ہے جس میں تمھاری حاضری سخت ضروری ہے
میں نہیں سمجھتا کہ اس میں ابوبکر ہی کی کیا ضرورت تھی، اگر پہلے
سے کوئی سازش نہ ہوتی کہ جسے کامیاب بنانے کی کوشش ہو رہی تھی۔

(۲) ——— وفاتِ نبی کے بارے میں عمر کا موقف اور ان کا انکار۔ اس سلسلے
میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ عمر کے حواس معطل ہو گئے تھے۔ اس لیے
کہ ان کی زندگی اس قسم کی نہیں ہے جس کا صحیح اندازہ اس اہتمام
سے ہوتا ہے جو انھوں نے سقیفہ میں پہنچنے کے بعد کیا ہے۔ ظاہر
ہے کہ جو شخص کسی واقعہ کو سن کر بدحواس ہو جائے اس میں اتنی فکر
نہیں ہو سکتی کہ انصار کے مقابلہ میں باقاعدہ جہاد و دفاع جدال و
مخاصمت سے کام لے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ یہ رائے جس کا اعلان
عمر نے بعد وفاتِ نبی اکرمؐ کیا۔ اس کا عقیدہ انھیں چند روز
قبل تک نہ تھا جب پیغمبرؐ نے فرمایا۔ مجھے دوات و قلم دو تاکہ
ایسا نوشتہ لکھ دوں جو میرے بعد کام آئے۔ اور عمر نے کہہ دیا کہ
کتاب اللہ کافی ہے اور پیغمبرؐ پر مرض کا غلبہ ہے۔ وہ ہذیان
بک رہے ہیں (نعوذ باللہ) اس وقت تک ان کا اعتقاد تھا
کہ پیغمبرؐ کو موت آئے گی۔ ورنہ فوراً ٹوک دیتے اور کہہ دیتے
کہ نبیؐ کے لیے موت نہیں ہے۔ تاریخ ابن کثیر میں یہ لکھی ہے
کہ ابوبکر سے پہلے عمر بن زائدہ نے یہی آیت پڑھ کر عمر کو سنائی
تھی لیکن انھوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ جب وہی آیت ابوبکر نے
پڑھی تو اعتبار آ گیا۔ بھلا بتایئے اس کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے
اگر یہ نہ کہا جائے کہ عمر نے اپنی گفتگو سے مسلمانوں میں ایک

اضطراب پیدا کرنا چاہا تھا تاکہ لوگ اس کلام کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ابوبکر کے آنے سے پہلے خلافت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔ یہاں تک کہ ابوبکر کے آتے ہی ان کا دل مطمئن ہو گیا اور سمجھ گئے کہ اب بیتِ ہاشمی کی بیعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک مقابلہ کے امکانات باقی ہیں۔

(۳) ——— حکومت کی وہ ترتیب جو سقیفہ میں تشکیل پائی، ابوبکر والی خلافت[1] ابوعبیدہ والی مال اور عمر والی قضاوت اور آج کی اصطلاح میں پہلا والی سلطنت، دوسرا وزیر اقتصادیات، تیسرا وزیر جنائیات اور یہی حکومتِ اسلامیہ کے عظیم ارکان ہیں۔ ظاہر ہے کہ حکومت کی یہ ترتیب اور عہدوں کی یہ تقسیم جو کہ سقیفہ میں عمل میں آئی، کسی وقتی چارہ جوئی کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔

(۴) ——— عمر کا وقت وفات یہ کہنا کہ اگر ابوعبیدہ ہوتے تو انھیں کو حاکم بنا دیتا[2]۔ ظاہر ہے کہ اس تمنا کا سبب ابوعبیدہ کی صلاحیت نہ تھی اس لیے کہ عمر کو علیؑ کی استعداد کا پورا علم تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے نہ چاہا کہ علیؑ ان کی زندگی میں یا بعدِ موت حاکم ہو سکیں[3] ابوعبیدہ کی امانتداری (جیسا کہ عمر کا خیال ہے) بھی اس بات کی موجب نہ تھی اس لیے کہ پیغمبرؐ نے صرف ابوعبیدہ کی توصیف نہیں کی بلکہ اس دور میں ایسے اصحاب موجود تھے جنھیں پیغمبرؐ نے اس سے زیادہ محترم قرار دیا تھا جیسا کہ صحاح سنت و شیعہ میں

---

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۲ ثانی ص ۱۶۱ [2] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۶۴
[3] الانساب بلاذری ج ۵ ص ۱۶

موجود ہے۔

(۵) ——— فاطمہ زہرؑا کا حزب حاکم کو پارٹی بندی پر متہم کرنا (جیسا کہ آئندہ آئے گا)

(۶) ——— امیرالمومنینؑ کا وہ کلام جو آپ نے عمر سے فرمایا تھا، اے عمر وہ دودھ[1] مہیا کرے جس میں تیرا بھی حصہ ہے آج کی محنت کل نتیجہ دے گی۔ اس کلام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اتفاق کی طرف اشارہ ہے جو دونوں میں پہلے سے ہو گیا تھا۔ ورنہ علیؑ تو سقیفہ میں موجود بھی نہ تھے وہ کیا سمجھتے کہ خلافت کس ترتیب سے قرار دی گئی ہے۔ (العیاذ باللہ)

(۷) ——— معاویہ کا وہ خط جو اس نے محمد بن ابوبکر کو لکھا تھا اور اس میں تذکرہ کیا تھا کہ تیرے باپ اور عمر نے علیؑ کے حق کو غصب کیا تھا چنانچہ لکھتا ہے: "ہم اور تمھارے دونوں علیؑ کے فضل کو پہچانتے تھے، ان کا حق ہم پر واجب الوفا تھا۔ لیکن جب رسول اکرمؐ نے دنیا سے رحلت فرمائی تو تمھارے باپ اور فاروق نے ان کی مخالفت کر کے ان کا حق چھین لیا۔ اور اپنی بیعت لینا شروع کر دی اور اس سے مقصد ایک بہت بڑی بات تھی[2]

واضح ہے کہ بیعت کا دونوں کے اتحاد کے بعد ذکر کرنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ یہ ایک سازش تھی جو آج کے پہلے سے تیار ہو چکی تھی۔

میں اپنے موضوع کو اس سے زیادہ طول دینا نہیں چاہتا۔ صرف یہ پوچھنا چاہتا

---

[1] شرح نہج البلاغہ ج ۲ ص ۵

[2] مروج الذہب ج ۲ ص ۳۱۵

ہوں کہ کیا کوئی تاریخی ثبوت یہ بتاتا ہے کہ ابوبکر خلافت نہ چاہتے تھے جیسا کہ بعض کا خیال ہے مجھے تو سقیفہ کے قصہ ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خلافت کے بڑے خواہاں تھے۔ اس لیے کہ خلافت کے شرائط بیان کرنے کے بعد انھوں نے فوراً دونوں ساتھیوں کا نام پیش کر دیا جس کا طبعی نتیجہ یہ تھا کہ کسی ایک کے لیے بات طے ہو جائے۔ خلیفہ کی یہ جلد بازی اور پھر اس ترتیب کے ساتھ اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ ان کا مقصد اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھا کر انصار کا حق چھیننا تھا، جس کا نتیجہ اپنا تقرر ہوتا۔ اس لیے کہ جب دونوں نے ان کا نام پیش کر دیا تو انھوں نے کوئی تردد ظاہر نہ کیا۔ اور فوراً قبول کر لیا۔

اسی بات کو عمر نے بیان کیا ہے ایک طویل حدیث میں جس میں واضح کیا کہ وہ (ابوبکر) طالب حکومت اور حاسدترین قریش تھے[1]

زمانۂ حیاتِ پیغمبرؐ میں بھی شیخین کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں کوئی مہم ضرور تھی جس کے لیے برابر کوشاں تھے۔ جیسا کہ روایاتِ اہل سنت میں وارد ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا

"میں نے تنزیل قرآن پر جہاد کیا ہے تم میں سے ایک شخص تاویل قرآن پر جہاد کرے گا۔"

ابوبکر بولے: میں ہوں؟ عمر بولے: میں ہوں؟

آپؐ نے فرمایا: "وہ جو جوتی ٹانکنے والا ہے یعنی علیؑ۔"

ظاہر ہے کہ تاویل پر جنگ زمانۂ رسولؐ کے بعد ہوگی اور مجاہد بھی امیرالناس ہوگا۔ اس لیے دونوں کو تمنا تھی کہ مجاہد ہم ہوں۔ حالانکہ تنزیل پر جہاد ان کے لیے زمانۂ رسولؐ میں زیادہ آسان تھا لیکن انھوں نے اس میں مطلقاً شرکت نہ کی۔ ان امور سے خلفاء ثلثہ کی نفسیات کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ ج ا ص ۱۲۵

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ کچھ لوگ حیاتِ رسول اکرمؐ میں ایسے تھے جو ابوبکر اور عمر کے لیے کام کر رہے تھے، جن کی راس و رئیس عائشہ و حفصہ تھیں جنھوں نے اپنے والدین کو فوراً بلا بھیجا جب پیغمبرؐ نے وقتِ آخر اپنے حبیب کو طلب کیا اور حالات نے بتایا کہ پیغمبرؐ کوئی وصیت کرنا چاہتے ہیں۔

بلکہ یہ ظاہر ہے کہ وہ روایت جس میں یہ وارد ہوا ہے کہ بعض ازواجِ نبیؐ نے اسامہ کے لشکر کو روک دیا تھا، اس سے مراد بھی یہی عورتیں ہیں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ نبیٔ اکرمؐ اس توقف سے ہرگز راضی نہ تھے ورنہ بعد میں آپ نے جلدی کرنے کا حکم نہ دیا ہوتا۔ اور یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ ان لوگوں کا رک جانا اور ان عورتوں کا روک دینا، کسی خاص سازش کی بنا پر تھا کہ جس میں ان کے چلے جانے سے کامیابی حاصل نہ ہو سکتی۔ یہ بات بھی ہمارے دعویٰ کو بخوبی واضح کرتی ہے۔

پیغمبرِ اسلام کے لشکرِ اسامہ کو بھیجنے کی جو تفسیر شیعوں نے کی ہے[1] اس سے دنیا واقف ہے اور وہ یہ کہ رسولِ کریمؐ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس خاص بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ اب اگر یہ لوگ مدینہ میں رہ گئے تو علیؑ سے ضرور مقابلہ کریں گے۔

اگر ہم اس بات میں شک کریں تو کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ پیغمبرؐ نے کئی مرتبہ علیؑ و ابوبکر کو ترازو کے پلوں میں رکھ کر دنیا کو دکھا دیا تھا کہ ان دونوں میں کبھی برابری نہیں

لے مسند احمد ج ۳ ص۳۳ میں ہے کہ پیغمبرؐ نے قریش کو ایک ایسے مرد جری سے ڈرایا کہ جس کے دل کا امتحان اللہ ایمان کے لیے کر چکا تھا اور وہ دین کی خاطر قریش کی گردنیں اڑائے گا۔ تو ایک سائل نے پوچھا وہ مرد ابوبکر ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ پوچھا عمر؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ روایت میں اس سائل کا نام نہیں ہے لیکن واضح ہے کہ جبکہ ابوبکر و عمر کی شجاعت و بہادری کا کوئی چرچا نہ تھا تو سائل کی غرض کچھ اور ہی ہوگی۔ اس کا فیصلہ آپ کے ذمہ ہے۔

[1] شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص۱۲۵

ہو سکتی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا یہ فطری بات ہے کہ سورۂ برأت ایک شخص کو دیا جائے اور پھر چھین لیا جائے۔ وحیٔ الٰہی اس امر کی منتظر تھی ابوبکر آدھے راستے تک پہنچ جائیں تو نازل ہو کر انھیں واپسی کا حکم دے اور علیؑ کو بھیج دے۔

کیا اس کو عبث کہا جائے یا غفلت یا کوئی تیسری بات؟ اور وہ یہ کہ رسولؐ نے محسوس کر لیا کہ ابوبکر میرے ابنِ عم سے حسد کرتے ہیں۔ لہٰذا اچھا کہ ابوبکر کو بھیج کر واپس بلا لیا جائے۔ اور دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ کارِ تبلیغ علیؑ ہی کا کام ہے جو کہ نفسِ رسولؐ ہے نہ کہ ابوبکر کا۔ اب اگر ایک شخص ایک سورہ کا امین نہ بن سکے تو پورے قرآن کا امین کیسے بن سکتا ہے۔

ہم ان تمام بیانات کو دو مختصر نتیجوں پر ختم کرتے ہیں:

(۱) ——— خلیفہ کو خلافت کی بڑی فکر تھی۔ چنانچہ وہ اس کے لیے برابر کوشاں رہتے تھے۔

(۲) ——— صدیق و فاروق و ابوعبیدہ ایک سیاسی پارٹی بنائے ہوئے تھے جس کے نمایاں خطوط تاریخ میں نظر نہیں آئے لیکن اس کے وجود پر متعدد تاریخی شواہد موجود ہیں۔ اس میں ان کی کوئی توہین نہیں ہے بلکہ انھیں یہی فکر ہر وقت رہنی چاہیے تھی، اگر رسول اللہؐ کی کوئی نص اس موضوع میں نہ ہوتی لیکن اگر نصِ رسولؐ ثابت ہو جائے تو پھر سیاست سے ان کی ظاہری علیحدگی اور سقیفہ کی کارروائی کو وقتی چارہ جوئی قرار دینا انھیں خدائی مسئولیت سے بری نہیں کر سکتا۔

حزبِ حاکم کی رفتار آلِ محمدؐ کے ساتھ

میں اس وقت اس موقف کا تجزیہ نہیں کرنا چاہتا جس میں انصار اور

تین مہاجرین میں مقابلہ ہوا تھا تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس وقت مسلمانوں کی نفسیات کیا تھیں اور سیاسی مزاج کیسا تھا، اس لیے کہ یہ باتیں میرے موضوع سے ایک حد تک دور ہیں۔ مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت اس سہ نفری جماعت کے تین گروہ مخالف تھے۔

(۱) ——— انصار: جنہوں نے خلیفہ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ سقیفہ میں جھگڑا کیا اور اس دینی منصب کے لیے بھی رشتہ داری اور قرابت کی اہمیت کے قائل ہوتے اور دو گروہوں میں تقسیم ہونے کی بنا پر ناکام ہوگئے۔

(۲) ——— بنی امیہ: جن کا مقصد یہ تھا کہ حکومت انھیں بھی ملے اور وہ سیاسی بزرگی کہ جو انھیں ایام جاہلیت میں حاصل تھی پھر پلٹ آئے۔ اس جماعت کا لیڈر ابوسفیان تھا۔

(۳) ——— بنی ہاشم اور ان کے رفقاء: عمار، سلمان، ابوذر، مقداد وغیرہم جن کا خیال تھا کہ نبیؐ کا طبیعی وارث ہاشمی گھرانہ ہے۔

ابوبکر اور ان کے ساتھیوں نے پہلی جماعت سے مقابلہ کیا اور اپنی اہمیت کے لیے ایسی بات پیش کر دی جو وقتی طور سے بہت کامیاب رہی۔ اس لیے کہ جب قریش عشیرۂ رسولؐ میں رہیں گے تو ان کے مقابلے میں کوئی دوسرا فریق نہیں آسکتا۔

ابوبکر اور ان کے اصحاب کو انصار کے سقیفہ میں اجتماع کرنے سے دو فائدے حاصل ہوئے:

(۱) ——— وہ انصار جنہوں نے اپنا مستقل مذہب بنا لیا تھا اب اس امر سے مجبور ہوگئے کہ وہ علیؑ کا ساتھ دیں اور حقیقت کو اجاگر کرسکیں۔

(۲) ——— ابوبکر کو مہاجرین کے حقوق سے دفاع کرنے کا ایسا موقع ہاتھ آگیا تھا جیسا موقع شاید ان کو زندگی بھر ہاتھ نہ آتا۔ اس لیے

کہ جہاں چند مہاجرین جمع ہو جاتے وہاں ان کے حضور میں کوئی منصب ان کے ہاتھ نہ لگتا۔

ابوبکرؓ سقیفہ سے اس عالم میں برآمد ہوئے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ان کے ساتھ تھی یا اس لیے کہ انھوں نے اس دلیل کو پسند کر لیا تھا جو ابوبکر نے پیش کی تھی۔ یا اس لیے کہ وہ سعد بن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرنا چاہتے تھے۔

حکام وقت نے بنی امیہ کے مقابلہ کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ حالانکہ ابوسفیان نے اپنے سفر سے پلٹ کر بڑا ہنگامہ مچایا۔ صرف اس لیے کہ وہ لوگ بنی امیہ کی لالچی طبیعتوں سے واقف تھے۔ ان کی نظر میں ان لوگوں کا ساتھی بنا لینا بڑا آسان کام تھا۔ جیسا کہ ابوبکر نے کیا اور خود یا عمر کے مشورے سے جملہ اموالِ مسلمین جو ابوسفیان کے ہاتھ میں تھے اس کے لیے مباح کر دیے۔ اور پھر بنی امیہ کو حکومت میں بھی ایک حصہ دے دیا۔

اس طرح سے حزبِ حاکم دونوں جماعتوں کے مقابلہ میں کامیاب تو ہو گیا لیکن اسے اس بات کی خبر نہ ہوئی کہ ہم نے ایک متضاد سیاست سے کام لیا ہے۔ اس لیے کہ سقیفہ کا میدان حکام کو مجبور کر رہا تھا کہ قرابتِ رسولؐ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیں اور ریاستِ دین کے لیے وراثت کو اصل قرار دیں۔

لیکن بعد کے حالات اس سے مختلف ہو گئے چنانچہ انھوں نے اپنی سیاست کا رخ بدل دیا۔ اس لیے کہ قرابتِ رسولؐ کی وجہ سے اگر قریش دوسروں سے افضل ہیں تو بنی ہاشم تو بہرحال سب سے افضل ہوں گے۔

اسی بات کا اعلان کرتے ہوئے امیرالمومنین نے فرمایا تھا کہ :

۱؎ شرح نہج البلاغۃ ج ۱ صفحہ ۱۳۰

۲؎ اس واقعہ کے مطالعہ سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے جو ہمیں نے ابتدا میں اٹھایا تھا اور وہ یہ کہ اگر خلفاء کا موقف علیؑ کی طرح دشوار گزار ہوتا تو کیا کرتے۔

" اگر ان لوگوں نے انصار کے مقابلہ میں اپنی قرابت کو
پیش کیا تو ہماری حجت ان پر قائم ہے۔ لہٰذا اگر ان کی دلیل
کامیاب ہے تو حق ہمارا ہے اور اگر ناکام ہے تو انصار صحیح کہتے ہیں"۔

اور اسی فقرہ کی وضاحت عباس نے ابوبکر کے سامنے سلسلۂ بیان میں کردی اور کہا کہ تمہارا خیال ہے کہ تم شجرۂ پیغمبرؐ سے ہو تو یاد رکھو کہ تم ہمسایہ ہو اور ہم شاخیں۔

ایسے وقت میں ہاشمین کی ہیبت حکامِ وقت کے دلوں پر چھائی ہوئی تھی اس لیے کہ ان کی نظر میں علیؑ کے پاس دو طاقتیں تھیں:

(۱) —— مادی جماعتوں کو اپنا ساتھی بنا لیں اور اس کی آسان ترکیب یہ تھی کہ ابوسفیان و مغیرہ بن شعبہ وغیرہ جو اس وقت ضمیر فروشی پر بُری طرح آمادہ تھے ان کو کچھ دے کر ہموار کرلیں۔ جیسا کہ خود ابوسفیان نے خفیہ طور سے علیؑ سے کہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب ابوبکر نے جملہ جمع کردہ مال اس کو بخش دیا تو خاموش ہو گیا۔ اور پھر زبان سے کوئی کلمہ نہ نکالا۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک جماعت پر مادی خواہش غالب آگئی تھی اور علیؑ میں اتنی طاقت تھی کہ ان کا پیٹ بھر کر ان کو اپنا ساتھی بنا لیں اس لیے کہ ان کے پاس مالِ خمس اور غلاتِ فدک سے بہت کچھ جمع ہو سکتا تھا۔

(۲) —— اس فکر سے کام لیں جو اس وقت عوام کے اذہان پر چھائی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ لوگ خاندانِ رسالت کا زیادہ احترام کرتے تھے بہ نسبت ان لوگوں کے جو صرف شجرہ میں کبھی شریک رہے ہوں۔

اس کا اظہار علیؑ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے: "ان لوگوں نے شجرہ کو لے لیا اور ثمر کو ضائع کر دیا۔"

حزب حاکم نے یہ دیکھا کہ میری مادی سیاست بہت کمزور ہے۔ اس لیے کہ اطراف مدینہ کہ جو مرکز اموال ہیں وہ اس وقت تک سر نہ جھکائیں گے جب تک مدینہ والے انھیں باقاعدہ تسلیم نہ کریں حالانکہ مدینہ ابھی باقاعدہ ہموار نہیں ہوا۔

اگرچہ ابوسفیان وغیرہ نے اپنا ضمیر حکومت کے ہاتھ بیچ دیا تھا لیکن پھر بھی حکومت کو یہ خطرہ تھا کہ یہ ضمیر پھر اس کے ہاتھ بک سکتا ہے جو اس سے زیادہ دولت صرف کر دے۔ اور یہ کام علیؑ کے لیے بہت آسان تھا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ علیؑ سے ان کے جملہ اموال چھین لیے جائیں تاکہ انصار کی قوتیں حکومت وقت کے ساتھ رہیں اور علیؑ اہل حرص وطمع کی کوئی جماعت تیار نہ کر سکیں۔

اس احتمال کو ذرا بھی بعید نہیں کہا جا سکتا جب تک ہمیں حکومت وقت کا مذاق اس بات کا ثبوت پہنچاتا رہے گا اور جب تک ہمیں اس امر کا علم رہے گا کہ صدیق نے ابوسفیان وغیرہ کی آواز کو درہم و دینار اور ولایت دے کر خرید لیا تھا۔

چنانچہ تاریخ میں ہے کہ جب ابوسفیان کو ابوبکر کی خلافت کی خبر ملی تو اس نے کہا مجھ سے کیا تعلق ہے۔ لوگوں نے کہا کہ تیرے لڑکے کو بھی حکومت ملی ہے تو وہ راضی ہو گیا[1]۔

اب یہ بات قطعاً قابل تعجب نہیں رہ جاتی کہ حکومت وقت ان اموال کو سلب کرے کہ جن سے علیؑ کے لیے پارٹی تیار کرنے کا احتمال تھا۔

یہ بات ہم صدیق کے لیے ہرگز عجیب نہیں سمجھ سکتے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے متعدد آوازیں مال کے ذریعے خریدی ہیں یہاں تک کہ انھیں کی ایک معاصر

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۰۲

عورت نے انھیں متہم کر دیا۔

چنانچہ تاریخ میں ہے کہ جب ابوبکر کے پاس اموال جمع ہوئے تو انھوں نے کچھ مال مہاجرین اور انصار کی عورتوں پر تقسیم کیا۔ اسی میں سے کچھ حصہ بنی عدی بن النجار کی ایک مومنہ کو بھیجا۔ اس نے پوچھا یہ کیا ہے؟

جواب ملا کہ خلیفہ وقت کی تقسیم!

وہ بول اٹھی: تم لوگ مجھے دین کے بدلے رشوت[1] دینا چاہتے ہو میں اس مال کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں گی — اور یہ کہہ کر واپس کر دیا۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ اموال خلیفہ کے پاس کہاں سے آئے؟ جبکہ زکوٰۃ کا جمع شدہ تمام مال انھوں نے ابوسفیان کو ہبہ کر دیا تھا!

کیا اب بھی میں نہ کہوں کہ یہ رسول اللہؐ کا وہ باقی مال تھا جس پر خلیفہ نے قبضہ کر لیا تھا اور جس کا فاطمہ زہراؑ مطالبہ کر رہی تھیں؟

میرا یہ خیال صحیح ہو یا غلط لیکن اس واقعہ سے اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ ہمارے جیسے احساسات اس وقت کے بعض اہل ایمان کے دلوں میں موجود تھے جیسا کہ مومنہ نے اظہار بھی کیا۔

یہ بھی ناقابل فراموش بات ہے کہ اقتصادی حالات خلیفہ کو اس بات کی دعوت دے رہے تھے کہ حکومتی اموال میں حتی الامکان اضافہ کیا جائے تاکہ آئندہ آنے والی مہموں میں اس سے کام لیا جا سکے۔

اور شاید یہی وہ چیز تھی جس نے خلیفہ کو غصب فدک پر آمادہ کیا۔ جیسا کہ عمر و ابوبکر کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمر نے فدک کی واپسی سے یہ کہہ کر منع کیا تھا کہ ابھی لشکر سازی میں مال کی ضرورت پڑے گی۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص۱۲۳

یہیں سے ملکیتِ شخصی[1] کے بارے میں دونوں خلفاء کی رائے بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ اگر حکومت اپنے امور کو ترقی دینا چاہے تو افراد کے مال کو بلا معاوضہ لے سکتی ہے افراد کی ملکیت حکومت کی ضرورت کے وقت ختم ہو جاتی ہے۔

اور یہی رائے اکثر ان خلفا کی رہی جو ابوبکر و عمر کے بعد تختِ حکومت پر قابض ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ تاریخ ان کے ان اقدامات سے پُر ہو گئی۔ صرف فرق یہ ہے کہ بعد کے خلفاء نے یہ قانون تمام مسلمانوں کے اموال پر نافذ کیا اور ابوبکر نے صرف بنتِ رسولؐ کے اموال پر۔

حاکم جماعت نے علیؑ کی دوسری طاقت (قرابتِ نبیؐ) کا علاج دو طریقوں سے کیا:

① ——— قرابتِ رسولؐ کی کسی اہمیت کے قائل نہ رہے اور اس طرح خود ابوبکر کی خلافت کے اس شرعی پردہ کو بھی چاک کر دیا۔ جو اس پر سقیفہ میں ڈالا گیا تھا۔

② ——— اپنے سابق عقیدہ پر باقی رہے لیکن متضاد باتیں وقتی تقاضوں کی بنا پر کرنے لگے اور اس طرح بنی ہاشم کی قرابت کو اپنے مقابلہ سے ہٹ کر باقی حالات میں تسلیم کرنے لگے۔

حکومت وقت نے اپنی عزت بچانے کے لیے اپنے عقیدۂ اہمیتِ قرابت کو باقی رکھ کر بنی ہاشم کو یہ کہہ کر دبانا شروع کیا کہ لوگوں کی بیعت کے بعد حرف زنی ایک ناجائز فتنہ کی بنیاد ہے اور اس طرح بنی ہاشم کو خاموش کرنا چاہا اور اپنی اس چالاکی میں کامیاب بھی ہوئے۔

---

[1] خدا بھلا کرے خلیفۂ سلمین کا کہ حضرت فاطمہؑ کا مال غصب کر کے آج کی نام نہاد اسلامی حکومتوں کے لیے اشتراکیت (سوشلزم) کا نظریہ چھوڑ گئے (مترجم)

ہم جب سیاستِ حاکمین وقت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں نے آلِ محمدؐ کے مقابلہ میں ابتدا سے ایک ہی روش اختیار کی تھی جس کا مقصد آلِ محمدؐ کی قوتوں کو کم کرنا تھا اور بیتِ ہاشمی کا وہ قدیمی امتیاز جو انھیں نسلاً بعد نسلٍ مل رہا تھا اسے ختم کرنا تھا۔

ہمارے پاس اس رائے پر حسب ذیل شواہد ہیں:

(۱) ——— خلفاء اور ان کے اصحاب کا علیؑ کے ساتھ سخت برتاؤ یہاں تک کہ عمر نے گھر میں باوجودِ فاطمہؑ زہرا آگ لگانے کی دھمکی دی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر میں فاطمہؑ کی اتنی حرمت بھی نہیں تھی کہ جو ان لوگوں کو اس برتاؤ سے روک سکے۔ اس کا مظاہرہ اس وقت بھی ہوا جب ابوبکر نے علیؑ کو فتنوں کی آماجگاہ قرار دیا حالانکہ عمر نے اعتراف کیا تھا کہ رسولؐ ہم سے بھی ہیں اور علیؑ سے بھی۔

(۲) ——— خلیفہ اوّل نے کسی مہم میں بنی ہاشم کو شریک نہیں کیا نہ ان کو کسی ایک بالشت زمین کا حاکم مقرر کیا۔ حالانکہ اموییّن پورے پورے ملک پر حاکم تھے۔ اس امر کا ایک قدیمی سازش کا پیداوار ہونا اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے جو ابن عباس اور عمر کے درمیان ہوئی جس میں عمر نے اس امر کا اظہار کیا کہ اگر بنی ہاشم اطراف مملکت اسلامیہ کے حاکم ہو گئے تو خطرہ یہ ہے کہ یہ سلسلہ باقی رہ جائے گا اور خلافت کا رخ بدل جائے گا[1] جب ہمیں عمر کی رائے سے یہ معلوم ہو گیا کہ اگر بنی ہاشم میں سے کوئی شخص کسی جزو حکومت کا

---

[1] مروج الذہب برحاشیہ تاریخ کامل ابن اثیر ج ۵ ص ۱۳۵

مالک ہوگیا تو وہ اپنی پوری حکومت قائم کرے گا اور خلافت پر قابض ہوجائے گا۔ اور ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ بنی امیہ جن کا کوئی طریقہ حیات مقرر نہ تھا وہ زمانہ ابوبکر وعمر میں بڑے بڑے منصب کے مالک تھے اور ہم نے شوریٰ کی ترتیب سے یہ اندازہ بھی کرلیا کہ خلافت بنی امیہ کے رئیس عثمان ہی کو ملے گی تو ہمیں ایک بہت عظیم نتیجہ ہاتھ آگیا۔ اور وہ یہ کہ عمر و ابوبکر خلافت بنی امیہ کے اسباب برابر پیدا کر رہے تھے اور انھیں بخوبی معلوم تھا کہ بنی امیہ جو کہ بنی ہاشم کے قدیمی دشمن ہیں، ان کی سیاسی شخصیت کا نمایاں کردینا بنی ہاشم کو قیامت تک کے لیے ایک مقابل سے دست و گریباں کردینا ہے اور اس طرح بنی ہاشم سے ہماری شخصی عداوت ایک قومی عداوت کا رنگ اختیار کرے گی اور پھر یہ مقابلہ اس طرح وسیع ہوتا جائے گا۔ اس لیے کہ اس کا تعلق ایک شخص سے نہیں بلکہ ایک قوم سے ہے جس کے نتیجہ میں بنی امیہ کی حکومت میں وہ استحکام پیدا ہوجائے گا کہ بنی ہاشم اسے تاقیامت ختم نہیں کرسکتے۔[1]

(۴) ——— خلیفہ کا خالد بن سعید بن عاص کو قیادت جیش سے معزول کردینا، صرف اس بات پر کہ عمر نے انھیں اس کی قلبی محبت پر مطلع

---

[1] قضیہ شوریٰ کا یہی وہ سیاسی راز ہے جس سے محققین نے غفلت برتی ہے۔ اس لیے کہ روایت میں ہے کہ عمر نے تمام اہل شوریٰ کو معاویہ سے ڈراتے ہوئے یہ کہا تھا کہ عنقریب وہی مالک امور اور حاکم سلطنت ہوگا۔ شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۶۲۔ یہ کلام اگر ہوشمندیٔ عمر پہ دال ہے تو سیاسی چالوں پر اوّل۔

کر دیا جو اسے آلِ محمدؐ سے تھی اور اس کے وہ مجاہدات یاد دلائے جو کہ اس مردِ میدان نے بعد وفات رسولؐ ان کے مقابلے میں کیے تھے[1]

اگر ہم اس موضوع کو طول دینا چاہیں تو اس میں قصۂ شوریٰ کا بھی اضافہ کریں گے کہ جہاں عمر نے علیؑ کو ان پانچ اشخاص کے برابر کر دیا جن کو روحانیت و نورانیت کے اعتبار سے علیؑ سے کوئی نسبت نہ تھی۔ یہی وہ زبیر ہیں کہ جنھوں نے وقت وفاتِ پیغمبرؐ مستحقِ خلافت صرف علیؑ کو سمجھا تھا لیکن عمر نے انھیں مقابل قرار دے کر اور حکومت کا لالچ دلا کر ایسا دیوانہ بنا دیا کہ یہ فکر ان کے ذہن سے بالکل جاتی رہی۔

خلاصۂ امر یہ ہے کہ،

حزبِ حاکم کا مقصد صرف یہ تھا کہ بنی ہاشم کو عام انسانوں کے برابر قرار دے کر ان کا وہ خصوصی رشتہ جو انھیں رسولؐ سے حاصل تھا اسے بے وقار بنا دیا جائے۔

اگر حکام نے یہ سمجھ بھی لیا ہو کہ علیؑ اس وقت ہمارے مقابلہ میں انقلاب نہ کریں گے جب بھی وہ اس امر سے قطعاً مطمئن نہیں تھے کہ وہ آئندہ کوئی اقدام نہیں کریں گے۔ اس لیے ضروری تھا کہ جنگ قائم ہونے سے پہلے ہی علیؑ کی مادی اور معنوی قیمت کو گھٹا دیا جائے۔

فدک میں موقفِ خلیفہ اور طرزِ مخالفتِ آلِ محمدؐ

اب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ خلیفہ کو قضیۂ وراثت میں فاطمہؑ کے خلاف ایسا ہی قیام کرنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ اس نقطہ پر دو غرضوں کا اتحاد ہو رہا تھا۔ ایک طرف

---

[1] شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۳۵

فکر تھی کہ فدک کو چھین کر ان کی مادی قوت کم کر دی جائے اور دوسری طرف خیال تھا کہ فاطمہؑ کی توہین کر کے آلِ محمدؐ کا وقار گھٹا دیا جائے ۔

ورنہ پھر کون سی شے فدک دینے سے مانع تھی جبکہ فاطمہؑ نے خود ہی وعدہ کیا تھا کہ اس کے منافع کو مصالح مسلمین پر صرف کریں گی ۔ شاید خلافتِ وقت نے محسوس کیا ہو کہ فاطمہؑ کی مراد مصالح مسلمین سے اپنے شوہر کی خلافت ہے ورنہ مال مسلمین ہی سمجھ کر کچھ فاطمہؑ کو دے دیا جاتا جبکہ صحابہ اس سے راضی تھے ۔

جب ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ فاطمہؑ کا وجود ان کے شوہر کے لیے بہترین سند تھا اور یہ ایک ایسی دلیل تھی جس کے سامنے جملہ انصار سر جھکا دیتے تھے تو یہ بھی واضح ہو گیا کہ نزاکتِ وقت کے لحاظ سے خلیفہ کو فاطمہؑ کا سخت مقابلہ کرنا چاہیے تھا تاکہ مسلمانوں پر یہ امر واضح کر دیا جائے کہ فاطمہؑ عورت ہے اور عورت کی رائے کا معمولی مسائل میں بھی کوئی وزن نہیں ہوتا چہ جائیکہ اہم مسائل میں اور یہ بھی لوگوں کو سمجھا دیا جائے کہ فاطمہؑ ایک زمین کا ناحق دعویٰ کر سکتی ہیں تو خلافت کا دعویٰ بھی ان کے لیے ایسا ہی ہو گا ۔

ان ابحاث کے بعد ہم غصبِ فدک کی دو توجیہیں کر سکتے ہیں :

(۱) ـــــ خلیفہ کے اقتصادی حالات نے انھیں مجبور کر دیا تھا ۔

(۲) ـــــ ابوبکر کو خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ علیؑ منافع فدک کو صرف کر کے اپنی حکومت قائم کر لیں ۔

اسی طرح فاطمہؑ سے اس سخت مقابلہ کی بھی دو وجوہات ہو سکتی ہیں :

(۱) ـــــ خلیفہ کے کچھ نفسانی جذبات تھے جو ان کے دل میں تڑپ رہے تھے جس کے اسباب ہم بیان کر چکے ہیں ۔

(۲) ـــــ یہ ایک طویل و عریض سیاست تھی جس کو ابوبکر نے جملہ بنی ہاشم

لے شرح نہج البلاغۃ ج ۴ ص۸۴

کے مقابلہ کے لیے اختیار کیا تھا، جیسا کہ واضح کیا گیا۔

امامؑ کا حزبِ حاکم سے عظیم مقابلہ

امیر المومنینؑ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ راہِ اسلام میں وہ قربانی اور ذاتِ احدیت سے وہ اخلاص ہے جس کی بنا پر انھوں نے جملہ شخصی امتیازات کو ختم کر کے ایک ایسی بلند حقیقت کی بنیاد قائم کر دی جو حیاتِ عقیدہ تک باقی رہے گی۔

اس قربانی کا مظاہرہ میدان شوریٰ میں کیا گیا۔ جہاں علیؑ نے ذاتِ خالق میں فنا ہونے کی ایک اعلیٰ مثال قائم کی۔

رسول اکرمؐ نے ایک طرف بُت پرستی کی گمراہیوں کا قلع قمع کیا اور دوسری طرف اپنے حقائق اور معارف کے فیضان سے علیؑ میں وہ بیداری پیدا کر دی کہ جس کی وجہ سے حیاتِ انسانی کی مرکزی خواہشات مر کر فنا ہو گئیں لیکن ایمان و عقیدہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہ گئے۔ اور علیؑ کی زندگی بھی انھیں کی حیات سے وابستہ ہو گئی[1]

اگر انسانیت کی راہ میں قربانیوں کی ترتیب کے لیے کوئی کتاب لکھی جائے تو علیؑ کا نام اس کی دائمی[2] سرخی ہوگا۔

اگر قوانینِ سماویہ کی کوئی عملی تعبیر ہو سکتی ہے تو وہ ذاتِ علیؑ ہے۔

---

[1] ارشاد رسولؐ اکرم "علیؑ مع الحق والحق مع علیؑ" علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ ان دونوں میں تا قیامت جدائی نہیں ہو سکتی۔ ملاحظہ ہو تاریخ بغداد خطیب ج ۱۴، ص ۳۲۱، تفسیر رازی ج ص ۱۱۱ کفایۃ الطالب گنجی ص ۱۳۵ مناقب اخطب خوارزم ص ۵۶ پیغمبرؐ نے یہ بھی دعا کی "بارالہا حق کا رخ ادھر موڑ دے جدھر علیؑ پھریں"۔ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۲۵ کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۷ ترمذی ج ص ۲۱۳

[2] ارشاد نبی کریمؐ "علیؑ کی ضربت عبادت ثقلین سے افضل و برتر ہے" مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۲

جو تا قیام قیامت قوانین الٰہیہ کی حکایت کرتی رہے گی۔

اگر پیغمبرؐ نے امت میں قرآن و علیؑ کو چھوڑا ہے تو صرف اس لیے کہ قرآن، علیؑ کے کارناموں کو بیان کرے اور علیؑ، قرآن کے عملی نمونے پیش کریں۔[1]

اگر اللہ نے علیؑ کو نفسِ رسولؐ قرار دیا ہے تو صرف یہ بتانے کے لیے کہ حیاتِ پیغمبرؐ، حیاتِ علیؑ کی صورت میں جاری رہے گی اور علیؑ کے پہلو میں وہی دل ہے جو نبیؐ کے سینے میں تھا۔[2]

اگر نبی اکرمؐ مکہ سے علیؑ کو بستر پر لٹا کر نکلے تو صرف یہ بتانے کے لیے کہ ہماری حیات کی راہیں ہمارے خالق کی طرف سے متعین ہوتی ہیں۔

اگر مسئلہ الٰہیات یہ چاہتا ہے کہ کوئی شخص اسے نمایاں کرے اور کوئی اس کی راہ میں قربان ہو تو نبیؐ کی ہجرت اور علیؑ کی قربانی کی شدید ضرورت تھی۔

اگر وحیٔ سماوی نے صرف علیؑ کے لیے مسجد[3] میں جانا خاص حالات میں جائز قرار دیا ہے تو اس کا مطلب صرف علیؑ و مسجد کی یکسانیت ہے کہ مسجد دنیائے مادہ میں رمزِ الٰہی ہے اور علیؑ عالمِ عقیدہ و روحانیت میں۔

اگر آسمان نے علیؑ کی مدح لافتیٰ[4] کہہ کر کی تو صرف اس لیے کہ علیؑ ہی کی طاقت، قرآن کا وقار قائم کرسکتی ہے اور اسی کی مردانگی تک انسان کی

---

[1] حدیث ثقلین، صواعق محرقہ ص ۱۳۶ (عبقات الانوار، حدیث ثقلین)

[2] تفسیر رازی، آیت مباہلہ، اسباب النزول واحدی ص ۷۴

[3] مسند احمد ج ۴ ص ۳۶۹، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۲۵، شرح نہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۵۱، تذکرہ ابن جوزی، مناقب خوارزمی، تاریخ الخلفاء سیوطی، صواعق ابن حجر، خصائص نسائی۔

[4] تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۰۱، سیرت ابن ہشام، شرح نہج البلاغہ، مناقب خوارزمی۔

قوتیں اور اس کا اخلاص نہیں پہنچ سکتا۔

یہ زمانہ کا مذاق تھا کہ جن فتوحات کی مدح آسمان سے کی جائے انھیں کو علیؑ کے نقائص میں شمار کیا جائے۔ اور ان کو اس ابوبکر سے گھٹا دیا جائے جس نے دنیا میں ان سے زیادہ اتنی ہی زندگی کی جس میں وہ کفر و شرک کی آماجگاہ تھا۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ ذات جو کفر و اسلام کا سنگم تھی کیوں کر مقدم ہو گی اس ہستی پر جس کی ابتدا اعلانِ توحید سے اور انتہا سجدۂ بندگی پر ہوئی۔

حضرت علیؑ کی یہی مرکزی حیثیت وہ تھی کہ جس کے اعتراف سے خود حضرت عمر بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ بلکہ انھیں اعلان کرنا پڑا: "لولا علیٌ لھلک عمر"

اور اسی طاقت کا ظہور اس وقت ہوا جب مسلمان علیؑ کے پاس جمع ہو کر انھیں خلافت پر مجبور کرنے لگے۔ ایسے اجتماع کے ساتھ کہ جس کی تاریخ میں نظیر کم ملتی ہے۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ علیؑ اپنی سماوی طاقت کی بنا پر اسلام کی ضروریاتؒ میں سے ایک ضرورت تھے اور یہ وہ آفتاب تھا جس پر فلکِ اسلامی کی گردش موقوف تھی۔

حالاتِ زمانہ نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ سیاستِ وقت میں فوری انقلاب پیدا کرنا ایک غیر ممکن سی بات تھی اس لیے کہ یہ بات شخصیتِ امامؑ کے منافی بھی تھی جس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ سیاستِ وقت ٹیڑھی راہ اختیار کرے۔ یہاں تک کہ اس نقطہ پر پہنچ جائے جہاں تک کہ امویین نے اسے پہنچایا۔ اس کے بعد تو خود راہ راست

ؒ اس بیان کی روشنی میں رسول اکرمؐ کے اس فقرہ کے معنی سمجھیں جو آپ نے جنگِ تبوک میں جاتے ہوئے فرمایا تھا "یا علیؑ یا میں رہوں یا تم رہو" ملاحظہ ہو خصائص نسائی صہ۷
مسند احمد ج ۱ ص ۳۳۱، مناقب خوارزمی ص ۹۷، ذخائر العقبیٰ ص ۸۷

پر آجائے گی جس طرح کہ گاڑی جب راہ سے منحرف ہو جاتی ہے تو اسے کھینچ کر راستہ پر آنا پڑتا ہے۔

حیاتِ علوی کا یہ وہ موضوع ہے جو انتہائی تفصیل کا طالب ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ علیؑ کی اس سیاست کو خوب واضح کیا جائے کہ انھوں نے کس طرح حکومتِ وقت کی مخالفت کی اور اسی کے ساتھ اس کو راہ راست پر بھی لگا دیا۔

اگر امامؑ کے جملہ اقدامات ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں تو خلافت میں آپ کا اقدام اور بھی بلند درجہ رکھتا ہے۔

امامؑ کا سکوت اور احادیث سے احتجاج نہ کرنے کے اسباب

اگر عقیدۂ الٰہیات ایک ایسا مجاہد چاہتا ہے جو اس پر اپنی جان قربان کرے تو اسے ایک ایسے انسان کی بھی ضرورت ہے جو اس قربانی کے مقصد کی ترویج کرے۔

اسی کام کے لیے خدا نے نبیؐ و علیؑ کا انتخاب کیا تھا۔ ایک نے فرش نبیؐ پر قربانی دی اور دوسرے نے مدینہ میں الٰہیات کی ترویج کی۔

امام علیؑ کے لیے یہ بات بعد وفات نبیؐ بالکل ناممکن تھی اس لیے کہ اگر وہ حکومتِ وقت کو راہ راست پر لانے کے لیے اپنی جان قربان کر دیتے تو دوسرا کون ہوتا جو ان قوانین کو تقویت پہنچاتا اور ان کی ترویج کرتا۔ سبطینِ پیغمبرؐ اگرچہ موجود تھے لیکن بوجہ کم سنی وہ مادی طور پر اتنا بڑا اقدام نہ کر سکتے تھے۔

علیؑ حکومتِ وقت کے خلاف ایک دوراہے پر کھڑے تھے جس کی دونوں راہیں خطرناک تھیں:

(۱) ــــــــ ابوبکر کے خلاف مسلح انقلاب کی مہم چلا دیں۔

(۲) ــــــــ جملہ مصائب و آلام کو برداشت کر کے خاموش ہو جائیں۔

اگر انقلاب کرتے تو اس کے نتائج کیا ہوتے۔ اس کو ہم تاریخ کی روشنی میں آئندہ واضح کریں گے۔

ظاہر ہے کہ حکامِ وقت معمولی مقابلہ سے تاج و تخت سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے کہ مسئلہ خلافت میں وہ بہت حریص و طامع تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی حکومت کے استحکام کے لیے پورا پورا مقابلہ کرتے۔

اور اس وقت یہ امکان بھی تھا کہ سعد بن عبادہ اپنی حکومت کے لیے ایک دوسری جنگ کھڑی کر دیتے۔ جیسا کہ انھوں نے طالبینِ بیعت سے علی الاعلان کہہ دیا تھا :

"میرے ترکش کے تمام تیر جب تک ختم نہ ہو جائیں گے
اور میرے نیزے جب تک رنگین نہ ہو جائیں گے، میری تلواریں
جب تک کام کریں گی، میرے اہلبیت و انصار جب تک میرا
ساتھ دیں گے، میں تمھاری بیعت نہ کروں گا۔"

میرا خیال ہے کہ اس وقت انھوں نے اپنے پاس جنگ کی قوت نہیں دیکھی، اس لیے صرف تہدید و تخویف پر اکتفا کر لی۔ اور اس بات کے منتظر رہے کہ امورِ حکومت میں کچھ تنزلی ہو جائے تو تلوار نیام سے کھینچیں۔ پھر ایسے وقت میں انھیں حق تھا کہ ان کی غیرت و حمیت کو جوش آئے اور ان کا خوف جاتا رہے اور اس طرح وہ حکومت وقت کو ضعیف سمجھ کر ایک نئی جنگ قائم کر دیں۔ اور اپنی تلوار سے مہاجرین کو مدینہ سے نکال باہر کر دیں۔ جیسا کہ انھوں نے سقیفہ میں اعلان کیا تھا۔[1]

ہم اس وقت بنی امیہ کو فراموش نہیں کر سکتے کہ وہ جاہ و حشم کے کس قدر دلدادہ تھے اور جبکہ آخری دور میں انھیں مکہ میں کچھ تصرف بھی حاصل ہو گیا تھا

---

[1] اس صورتحال کی روشنی میں واضح ہے کہ اگر علیؑ کوئی اقدام کرتے تو وہ نتیجہ خیز نہ ہوتا۔

اسی لیے تو ابوسفیان اسلام کے خلاف ہر جنگ میں آگے آگے رہتا تھا اور عتاب ابن اسید بھی رئیس بنا رہتا تھا۔

جب ہم تاریخ میں یہ واقعہ دیکھتے ہیں کہ جس وقت خبر وفاتِ پیغمبرؐ مکہ میں پہنچی تو آپ کا عامل عتاب بن ابی العاص بن امیہ مخفی ہو گیا اور شہر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ قریب تھا کہ اہل مکہ مرتد ہو جائیں۔ ہمیں وہ توجیہیں پسند نہیں آئیں جو لوگوں نے اس واقعہ میں کی ہیں۔ اور نہ ہم اس بات کو مان سکتے ہیں کہ وہ لوگ ارتداد سے صرف یہ خیال کر کے رک گئے کہ ابوبکر جب حاکم ہو جائیں گے تو ہم لوگ بھی مدینہ پر غالب آجائیں گے۔

اس لیے کہ خلافتِ ابوبکر روزِ وفاتِ پیغمبرؐ طے ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں خبریں مکہ ایک ساتھ پہنچی ہوں گی۔

بلکہ میرا احتمال تو یہ ہے کہ عتاب نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے اپنے کو مخفی کر دیا ہوگا۔ اور پھر جب اسے یہ معلوم ہو گیا کہ ابوسفیان نے بنی امیہ کے مصالح کی بنا پر حکومت وقت کو تسلیم کر لیا ہے تو ظاہر ہو کر اس نے امورِ حکومت سنبھال لیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی امیہ میں ایک سلسلہ اس وقت قائم ہو چکا تھا۔

ہم اپنے اس خیال کی تائید ابوسفیان کے ان اقوال سے کر سکتے ہیں جو اس نے ابوبکر کے خلاف کہے تھے جن کا ماحصل یہ تھا کہ اس گرد کو سوائے خون کے کوئی دوسری چیز بٹھا نہیں سکتی۔

اور علیؑ اور عباس کے بارے میں اس نے کہا: "ہم ان کے شانے پکڑ کر انھیں بلند کریں گے۔" اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اموییں اس وقت انقلاب کے لیے تیار تھے۔

---

[1] تاریخ کامل ج ۲ ص ۱۲۳

اور جب حضرت علیؑ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تو انھوں نے اس کی شرارت کو تاڑ لیا آپؑ پر یہ بات واضح تھی کہ اس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اسی لیے انھوں نے اس کی طلب کو ٹھکرا دیا۔ صرف یہ خیال کر کے کہ اگر میں نے کوئی اقدام کیا تو یہ لوگ اپنے مصالح کو نہ حاصل ہوتے ہوئے دیکھ کر مخالفت کریں گے اور ان کی مخالفت دین سے روگردانی تک منتہی ہو گی اور اس طرح مکہ و مدینہ میں ایک خلیج حائل ہو جائے گی۔

نتیجہ یہ ہوتا کہ علوی انقلاب ایک خونی انقلاب ہوتا جس کی پشت پر ہزاروں انقلابات تھے اور ایسے حالات سے منافقین اور مخالفینِ اسلام کو بڑے فائدے حاصل ہوتے۔

حالات اس قسم کے نہیں تھے کہ علیؑ تنہا اپنی آواز بلند کریں اور باقی آوازیں دب کر رہ جائیں۔ بلکہ اس کے عوض میں بڑی آوازیں بلند ہوتیں اور مختلف جنگیں ظہور میں آتیں اور ایسے سخت وقت میں اسلامی وقار تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا۔ جب کہ اسلامی اجتماع کی شدید ضرورت تھی اور مسلمانوں کو آئندہ آنے والے خطرات کے مقابلہ کے لیے پورے پورے اسباب کی احتیاج تھی۔

وہ علیؑ کہ جس میں راہ خدا میں قربانی کی پوری استعداد اس وقت سے موجود تھی جب وہ خانہ کعبہ میں متولد ہوئے اور اس وقت تک رہی جبکہ خانۂ خدا میں شہید ہوئے۔ انھوں نے اپنی حقیقی منزل اور اپنے الٰہی منصب کو صرف اس بات پر قربان کر دیا کہ اسلامی وقار نہ گھٹنے پائے۔

یہ اور بات ہے کہ اس طرح محمدیؐ پیغام کے بعض اجزا تشنۂ تبلیغ رہ گئے، اس لیے کہ دعوت ذوالعشیرہ میں بنی عبدالمطلب کو جمع کر کے جس طرح رسولؐ نے اپنی رسالت کا یہ کہہ کر اعلان کیا تھا کہ مجھ سے بہتر پیغام دنیا کا کوئی جوان نہیں لایا اسی طرح علیؑ کی خلافت کا اعلان ان الفاظ میں کیا تھا کہ یہ میرا بھائی —— وصی اور

خلیفہ ہے اس کی اطاعت تمھارا فریضہ ہے۔[1]

جس کا مطلب یہ تھا کہ خلافتِ علیؑ رسالتِ رسولؐ کا تتمہ ہے اور وحی سماوی محمد کبیرؐ و محمد صغیرؑ کے مناسب کا ایک ساتھ اعلان کر رہی ہے۔

وہ علیؑ جو پروردۂ آغوشِ رسولؐ تھا جس کے ساتھ اسلام اس طرح پرورش پا رہا تھا کہ گویا دونوں پیغمبرؐ کی عزیز اولاد اور آپس میں حقیقی بھائی تھے۔

اسے اس اخوت کا پورا احساس تھا اور اسی جذبے نے اسے اپنے بھائی کی پوری پوری موافقت پر آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ اس نے ارتداد کی جنگوں میں بھی شرکت کی اور مسلمانوں کی مخالفت اسے اپنے مقدس فریضہ سے نہ روک سکی[2]

ظاہر ہے کہ ابوبکر نے اگرچہ کرسیٔ حکومت کو چھین لیا، میراثِ رسالت کو غصب کر لیا لیکن اسی کے علی الرغم اسلام نے علیؑ کو اتنا بلند کیا کہ ان کے کارناموں کو سنہری حرفوں میں قرآن مقدس میں تحریر کیا۔

امامؑ نے انقلاب کا ارادہ بالکل ترک کر دیا ــــــــ لیکن اب کیا کریں ــــــــ؟ اور کون سی شکل اختیار کریں ــــــــ؟

آیا فریقِ مخالف کے سامنے نصوص پیغمبرؐ پیش کریں اور ان کلمات سے احتجاج کریں کہ جن میں پیغمبرؐ نے صراحتاً یہ اعلان کیا تھا کہ:

علیؑ ہی وہ محور ہے کہ جس پر فلکِ اسلامی چکر لگا رہا ہے اور علیؑ ہی وہ رئیس ہے جسے آسمان نے زمین کے لیے مقرر کیا ہے۔

یہ سوال علیؑ کے ذہن میں کروٹیں لیتا رہا۔ یہاں تک کہ حالاتِ حاضرہ

---

[1] تاریخ طبری؛ تاریخ کامل، شرح نہج البلاغۃ

[2] شرح نہج البلاغۃ ج ۴ ص ۱۶۵

اور کیفیاتِ موجودہ نے علیؑ کو یہ حل بتایا کہ نصوص کے پیش کرنے سے ایک مدتِ خاص تک خاموشی اختیار کریں۔

اس دور کے تشویشناک حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر علیؑ نصوصِ مقدسہ کو پیش کر کے ان سے احتجاج کرتے تو اس کا نتیجہ بڑا خراب ہوتا۔ اس لیے کہ اس وقت حق و باطل کے امتیاز کا پیمانہ سیمابی افکار اور مضطرب خواہشات کو قرار دے دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ نصوص پیغمبرؐ سے وہی لوگ واقف تھے جو مدینہ کے رہنے والے تھے اور یہ کلمات ان کے پاس بطور امانت محفوظ تھے جو عوام الناس تک انھیں کے ذریعے پہنچنے والے تھے۔ لہٰذا اب اگر امامؑ انھیں روایات سے احتجاج کرتے اور انھیں لوگوں کے سامنے بطور دلیل پیش کرتے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا کہ مخالف جماعت، صدیقِ امت کی تکذیب کر تی اور ان نصوص کا شدت سے انکار کرتی اور اس طرح کلامِ رسالت کا وقار مٹ جاتا اور لوگ دین سے خارج ہو جاتے۔

بہت ممکن ہے کہ علیؑ کی آواز میں اتنی طاقت نہ ہوتی جو اس نقار خانہ میں کارگر ہو سکے، اس لیے کہ اکثر قریش یعنی بنی امیہ تو خود ہی سلطنت کے طالب تھے اور انھیں یہ معلوم تھا کہ نصوص کی بنیاد پر کسی کو مقدم کر دینا مذہب امامیہ کی اساس کو مستحکم کر دینا ہے۔ اور اگر یہ نظریہ مسلمانوں کے دماغ میں راسخ ہو گیا تو حکومت آلِ محمدؐ میں منحصر ہو کر رہ جائے گی اور ہم ہمیشہ کے لیے اس سے محروم ہو جائیں گے۔

اس بات کا اندازہ بس عمر کے اس کلام سے ہوتا ہے جو اس نے ابن عباس سے علیؑ کو خلافت نہ دینے کے عذر میں پیش کیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ "قوم خلافت و نبوت کو ایک گھر میں نہیں دیکھنا چاہتی"[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے دن علیؑ کو خلافت دے دینا ہمیشہ کے لیے

---

[1] تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۴

بنی ہاشم میں منحصر کر دینے کے مرادف ہے۔ اس کی کوئی وجہ سوائے اس کے نہیں ہو سکتی کہ جمہور کی نظر میں یہ قانون بن جاتا کہ خلافت کا منصب آسمان سے ملنا چاہیے، انتخاب عوام سے کوئی فائدہ نہیں۔

لہٰذا اگر قریش، علیؑ کی جنگ میں مدد بھی کرتے تو مسئلہ نص میں تو بہرحال ساتھ نہ دیتے جب علیؑ یہ کہتے کہ:

" رسول اکرمؐ نے یہ فرمایا ہے کہ میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک قرآن دوسرے اہلبیتؑ "

رہ گئے انصار، تو انھوں نے نصوص کی توہین اسی وقت کر دی تھی جب سقیفہ بنی ساعدہ میں حکومت کی طمع لے کر پہنچ گئے تھے تاکہ کسی کو اپنا رئیس بنائیں ــــــــــ!

اب اگر علیؑ روایات پیش کرتے تو اس مجمع سے کون گواہی دیتا۔ جب کہ وہ جانتے تھے کہ علیؑ کی تصدیق کرنا ایک متضاد منطق میں مبتلا ہونا ہے اور یہ بات اپنے لیے کوئی شخص قبول نہیں کر سکتا خصوصاً ایسے وقت میں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ان لوگوں کا یہ کہنا کہ ہم غیر علیؑ کی بیعت نہ کریں گے۔ یہ بھی تو ایک تضاد ہے۔ تو یہ غلط فہمی ہو گی۔ اس لیے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خلافت انتخابی چیز ہے۔ ہم علیؑ کو چھوڑ کر ابوبکر کو منتخب نہ کریں گے، اس کا مطلب نصوص کو قبول کر لینا ہرگز نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ:

پھر مہاجرین کی بات کیوں مان لی ؟

تو اس کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ انصار نے پہلے سے کوئی خاص بات طے نہیں کی تھی بلکہ وہ تو ایک مشورہ کر رہے تھے جیسا کہ حباب بن منذر کی

اس سخت گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے جو انھوں نے مہاجرین کے خلاف کی تھی اور جس سے اجتماع میں ایک ہلچل مچ گئی تھی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ

امامؑ نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ روایات کا اظہار کرنا، حاکم جماعت کو اس کے انکار پر آمادہ کرنا ہے اور پھر اس وقت میں میری تائید کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ اس لیے کہ بعض لوگ تو وہ ہیں جنھیں خواہشات نصوص کی عملی مخالفت پر آمادہ کر رہی ہیں اور بعض وہ ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ نصوص کی تائید کر دینا خلافت کو بنی ہاشم کے نام وقف کر دینے کے مرادف ہے۔

اب جبکہ حکومت اور اس کے انصار نے مخالفت کی ٹھان لی ہے اور باقی نے سکوت اختیار کر لیا ہے تو روایات کا سنانا ان کی معنوی عظمت کا گھٹانا ہے اور ولائی امامت کو حقیقتاً تباہ کرنا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ مدینہ کے باہر والے سب انکار ہی کرتے، اس لیے کہ ان کا دار و مدار مدینہ پر تھا۔ اور مدینہ اسی انکار پر تلا ہوا تھا جس پر اسے خواہشات مجبور کر رہی تھیں۔

اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ ایک نہ ایک جماعت علیؑ کی تائید میں بھی پیدا ہو جاتی جو ان کے نصوص کی شہادت دے کر حکومت وقت کے انکار کا صحیح مقابلہ کرتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی نظر میں چڑھ جاتی اور وہ سلطنت جو اپنی شخصیت بنانے کے لیے پوری کوشش کر رہی ہے انھیں اذیت دینے پر آمادہ ہو جاتی اور آخرکار ایک جنگ کھڑی ہو جاتی جس کی مادی قوت فی الحال علیؑ کے پاس موجود نہ تھی، جیسا کہ ہم نے ثابت کر دیا۔

نصوص و احادیث سے احتجاج کا ایک اثر یہ بھی ہوتا کہ سیاست حاکمہ وہ تمام راہیں اختیار کرتی جن سے ذہنیت اسلامی سے احادیث نبویہ کو محو کر دیا جائے۔

اس لیے کہ اسے معلوم تھا کہ خلافت حاضرہ کے خلاف مخالف کے پاس یہی بہترین قوت ہے اور یہی قوی ترین اسلحہ۔

میرا خیال ہے کہ اگر عمر کو روایات کے ان تمام خطرات کا اندازہ ہو جاتا جو نبی امیہ کو پیش آئے جب روایات ان کے سامنے پیش کی گئیں تو پہلے ہی ان کی جڑیں کاٹ دیتے اور اس چراغ کو پہلے ہی خاموش کر دیتے۔

امامؑ کی نظر میں یہی انجام تھا۔

اسی لیے انھوں نے ان روایات کو چھپا لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سیاست وقت انھیں آج ہی کھلونا بنا دے اور پھر آئندہ انھیں پیش کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔ اسی لیے امامؑ نے دوسروں کی توجہ کو اس طرف سے موڑ دیا۔ حالانکہ عمر خود بھی حکم رسولؐ سے انھیں ولی المومنین کہا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ امامؑ کو اپنے بھائی کی کرامت کا بھی خیال تھا کہ نصوص کے ساتھ اس کی بھی توہین ہو گی۔ حالانکہ وہ ان کے نزدیک دنیا کی عظیم ترین ہستی تھی۔

ابھی تو امامؑ کی نظر میں وہ منظر بھی ہے جب ان کے بھائی نے قلم دوات طلب کیا تھا اور صحابی نے انھیں ہذیان گو کہہ دیا تھا، جس کے متعلق عمر نے ابن عباس سے اعتراف بھی کیا کہ وہ علیؑ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے[1]

ایسے حالات میں وہ روایات کیونکر سناتے؟

میں یہ نہیں کہتا کہ رسولؐ، علیؑ کو وصی ہی بنانا چاہتے تھے۔ مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ وہ صحابی جو پیغمبرؐ کی روبرو مخالفت کر سکتا ہے، انھیں حال حیات

---

[1] ظاہر ہے کہ جس کی نظر میں پیغمبرؐ کے سامنے ان کے ارشادات کا کوئی وزن نہ تھا وہ انتقال کے بعد ان فرامین کی کیا قیمت لگاتا۔ (مترجم)

ہیں دیوانہ کہہ سکتا ہے جس کی مخالفت قرآن و اسلام دونوں نے کی ہے، کیا اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ روایات کو سُن کر کہہ دیتا کہ یہ پیغمبرؐ کی طبعزاد ہیں۔ ان کو وحیِ الٰہی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا احتمال زیادہ قوی ہے۔

اس لیے کہ پیغمبرؐ کی تحریر سے اتنے خطرات نہ تھے جتنے علیؑ کے روایات کو سنا دینے سے پیش آنے والے تھے۔

اگر پیغمبرؐ وقتِ آخر نص کو صحابی کے قول کی بنا پر چھوڑ سکتے ہیں تو علیؑ بھی نص کو صحابی کے آئندہ اقوال کے احتمال کی بنا پر چھپا سکتے ہیں۔

میری بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ علیؑ ایک خاص وقت تک نصوص کے اظہار سے حسبِ ذیل امور کا تدارک کر رہے تھے۔

(۱) ——— اس وقت ایسے لوگ موجود نہ تھے جن کی شہادت پر علیؑ کو اطمینان ہوتا۔

(۲) ——— نصوص کو پیش کرنا جماعتِ حاکم کو ان کی قدر و قیمت کی طرف متوجہ کرنا تھا اور اس طرح ان کی توہین ہو جاتی۔

(۳) ——— نصوص سے اعتراض کرنا ایک بڑے انقلاب کے لیے آمادہ ہونا تھا جس کے لیے علیؑ قطعاً تیار نہ تھے۔

(۴) ——— عمر کے، آخر وقت میں نبیؐ کو متہم کر دینے سے علیؑ پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ یہ جماعت اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اور اپنی حکومت جمانے کے لیے ہر دینی اور مذہبی قدر کو بھینٹ چڑھا سکتی ہے اور اس طرح عظمتِ رسولؐ کی دوبارہ اہانت کا اندیشہ تھا۔

مطالبۂ فدک سیاستِ علویؑ کا

اعلیٰ ترین کارنامہ ہے'

امامؑ نے آخر کار ایک قطعی فیصلہ کر لیا اور وہ یہ کہ نہ کوئی انقلاب کریں گے اور نہ علی الاعلان اس وقت تک کوئی روایت پیش کریں گے جب تک لوگ ابوبکر و عمر و عثمان کے خلاف شہادت دینے کے قابل نہ ہو جائیں۔

اسی لیے علیؑ نے خفیتہً زعمائے مسلمین اور رؤسائے مدینہ کے دروازوں پر جا کر انھیں موعظہ کرنا شروع کر دیا۔ انھیں عذابِ الٰہی سے ڈرانے لگے اور ان کے ساتھ ان کی شریکۂ حیات بھی تھیں جو ان کے خاموش جہاد کی قیادت کر رہی تھیں۔

ظاہر ہے اس سے علیؑ کا مقصد لشکر کی جمع آوری نہ تھا اس لیے کہ علیؑ کے نام کو انصار نے پہلے بھی پیش کیا تھا۔ بلکہ مقصد صرف یہ تھا کہ خوفِ خدا کے احساس سے رائے عامہ میرے ساتھ ہو جائے۔

اب مسئلۂ فدک اٹھتا ہے جسے سیاستِ علوی میں صدارت کی جگہ حاصل ہے اس لیے کہ وہ فاطمی اقدام کہ جس کے خطوط ہارون نبوتؑ نے متعین کیے تھے اس شبانہ گردش سے بالکل متحد تھے جس میں فاطمہؑ شریک رہتی تھیں۔ اب گردشِ فاطمی اس بات کی سزاوار تھی کہ خلافت کا رخ بدل جائے اور خلافتِ صدیق کا یونہی خاتمہ کر دے جیسے آنکھ کھلتے ہی خواب کی انتہا ہو جاتی ہے۔

گردشِ فاطمی کا خلاصہ یہ ہے کہ صدیق سے اپنے مغصوبہ اموال کا مطالبہ کرے اور اسی طرح اس اساسی مسئلہ پر بھی اعتراض ہو جائے اور لوگوں پر واضح ہو جائے کہ انھوں نے علیؑ کو چھوڑ کر ایسے شخص کو اختیار کیا ہے جو ہوس کا بندہ اور خواہشات کا غلام ہے اور پھر قرآن و سنت کی صریح مخالفت کرتا ہے۔

جب یہ فکر فاطمہؑ کے ذہن نشین ہو گئی تو وہ اٹھیں، اس ارادہ سے کہ حالاتِ وقت کی اصلاح کریں اور حکومتِ اسلامی جس کی بنیاد سقیفہ میں پڑی ہے کے رُخ سے وہ گرد دھو دیں جس سے چہرۂ اسلام آلودہ ہو گیا ہے۔

اور اس کا بہترین ذریعہ ہے کہ حکومت کو کھلی خیانت سے متہم کریں اور لوگوں کو بتا دیں کہ یہ لوگ قوانینِ الٰہیہ کی توہین کرتے ہیں، ان کا انتخاب خلافِ سنت و کتاب اور دور از صحت و صواب ہے۔

فاطمہؑ کو مقابلہ کے لیے دو ایسی قوتیں حاصل ہو گئیں جو علیؑ کو حاصل نہ ہوتیں، اگر وہ بجائے فاطمہؑ قیام کرتے:

(۱) ——— فاطمہؑ اپنے مصائب اور اپنے باپؐ کی نظر میں اہمیت کے باعث زیادہ قادر تھیں اس بات پر کہ مسلمانوں کے احساس کو بیدار کر سکیں اور ان کے جذبات کو ابھار سکیں اور مسلمانوں کو اپنے باپؐ سے ایک روحانی رشتے کے ذریعے متصل کر دیں۔

(۲) ——— فاطمہؑ کو معلوم تھا کہ میری مخاصمت کسی حد تک پہنچ جائے لیکن اس میں کوئی مسلح جنگ نہیں قائم ہو سکتی۔ جب تک کہ میدان میں فاطمہؑ اور گھر میں علیؑ ہیں اب فاطمہؑ پر فتنہ کا الزام نہیں آ سکتا۔

اس وقت امامؑ نے چاہا کہ اپنی آواز فاطمہؑ کی زبان سے سنائیں اور خود میدان معرکہ سے دور رہ کر اس وقت کا انتظار کریں جب کہ قیام کر کے کچھ فائدہ حاصل کر سکیں۔ امامؑ نے یہ بھی چاہا کہ امت کے سامنے قرآن سے ثابت کر دیں کہ فاطمہؑ کا مقابلہ خود بھی بطلانِ خلافت کی واضح دلیل ہے۔

امامؑ نے جو چاہا انھیں حاصل ہو گیا۔ جب فاطمہؑ نے ان کی شخصیت کی وہ صحیح ترجمانی کی جس کے وہ اہل تھے۔

فاطمی مقابلہ کے مناظر

فاطمی اقدام کا خلاصہ ان مناظر میں مضمر ہے:

(۱) ——— فاطمہؑ نے ایک شخص کو بھیجا کہ ابوبکر سے مسائل میراث میں بحث کرے اور ان کے حقوق کا مطالبہ کرے۔ یہ فاطمہؑ کا پہلا تمہیدی قدم تھا جس کے بعد وہ میدان میں آنے والی تھیں۔

(۲) ——— فاطمہؑ خود ابوبکر کے سامنے آئیں اور چاہا کہ اپنی طلب میں شدت سے کام لیں تاکہ خلیفہ کی قوتِ مخاصمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

بعض حضرات نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مطالبہ کی ترتیب میں پہلے دعویٔ عطیہ تھا، اس کے بعد دعویٔ میراث، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ پہلے دعویٔ میراث ہی رہا ہو، اس لیے کہ روایت میں تصریح ہے کہ نمائندۂ فاطمہؑ نے صرف میراث کا مطالبہ کیا تھا اور اس کی نمائندگی کی شان بتاتی ہے کہ یہ پہلا قدم تھا، جبکہ فطرتاً مقابلہ تدریجی ہوتا ہے، علاوہ اس کے کہ دعویٔ وراثت کا اثبات بھی زیادہ آسان تھا۔ اس لیے کہ توارث شرعِ اسلامی کا واضح ترین قانون ہے۔ لہٰذا دعویٔ ارث سے ابتدا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے کہ اسی میں فدک داخل ہے۔ جیسا کہ خلیفہ کے انکارِ عطیہ سے اندازہ ہوتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ مطالبۂ میراث میں اور دعویٔ عطیۂ فدک میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس لیے کہ مطالبۂ میراث عام ترکۂ نبیؐ سے متعلق

نہ تھا، نہ کہ خاص فدک سے اور مطالبہ عطیہ فدک ہی سے متعلق تھا۔

(۳) ——— وفات پیغمبرِ اسلامؐ کے دس دن کے بعد فاطمہؑ نے مسجد میں خطبہ دیا۔ (شرح نہج البلاغۃ معتزلی)

(۴) ——— فاطمہؑ کی ابوبکر و عمر سے گفتگو، جب وہ عذر کرنے کے لیے آئے۔ اور آپ نے کہہ دیا کہ میں غضب ناک ہوں اور اس سے خدا و رسولؐ بھی ناخوش ہیں۔ (الامامۃ والسیاست ص۱۴)

(۵) ——— فاطمہؑ کا وہ خطبہ جو انھوں نے زنانِ مہاجرین و انصار کے درمیان ارشاد کیا تھا۔

(۶) ——— فاطمہؑ کی وصیت کہ میرے دشمن میرے جنازہ میں شریک نہ ہوں۔ (حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص۴۳ مستدرک حاکم ج ۳ ص۱۶۳، اسد الغابہ ج ۵ ص۵۲۴)

(یہ اعلانِ آخر تھا فاطمہ زہراؑ کی خلافت حاضرہ سے مخالفت کا)

فاطمہؑ کی ناکامی اور کامیابی

فاطمی اقدام ایک اعتبار سے ناکام رہا اور ایک اعتبار سے کامیاب۔

ناکام اس لیے رہا کہ فاطمہؑ اپنے آخری جہاد میں جو کہ وفات پیغمبرؐ کے دسویں روز بذریعہ خطاب کیا تھا حکومتِ وقت کو تباہ و برباد نہ کر سکیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ فاطمہؑ اس میدان میں ناکام کیوں ہوئیں؟ البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس ناکامی میں خلیفہ کی شخصیت کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس لیے کہ وہ سیاسی عطایا میں بڑے استاد تھے۔ انھوں نے فاطمہؑ کا مقابلہ اس ہنرمندی سے کیا کہ جس کا مظاہرہ فاطمہؑ کے کلام کے جواب اور انصار کے مجمع کے خطبہ سے ہوا۔ ایک طرف تو فاطمہؑ کے جواب

میں آنسو بہہ رہے تھے اور دوسری طرف دل میں آگ بھڑک رہی تھی کہ فاطمہؑ سامنے سے ہٹ جائیں تو انصار کو مطمئن کیا جائے۔ جیسا کہ ہوا۔ فاطمہؑ کے مسجد سے نکلتے ہی خطبہ شروع ہوگیا:

"تم لوگ ہر ایک کی بات سن لیتے ہو، یہ علیؑ کی ترجیح کرنا چاہتی ہیں جو کہ فتنوں کا مرکز ہیں۔۔۔۔ الخ"

رقت وگریہ سے غضب وغیظ کی طرف فوری انتقال یہ بتاتا ہے کہ خلیفہ کو حالات بدلنے کی چالوں پر پورا عبور حاصل تھا۔ اور وہ وقتی طور سے بہترین تمثیلیں بنا سکتے تھے۔

فاطمہؑ کامیاب اس طرح ہوئیں کہ انھوں نے حق کو ایک لازوال طاقت دے دی اور باطل کو نیست ونابود کر دیا۔ فاطمہؑ کی کامیابی کا اظہار اس وقت ہوا جب دونوں معذرت کے لیے آئے اور فاطمہؑ نے کہا کہ:

"ایک حدیث کی گواہی دو۔ میرے باپ نے فرمایا ہے کہ فاطمہؑ کی رضا میری رضا[1] اور فاطمہؑ کا غضب میرا غضب، جو اس کا دوست وہ میرا دوست، جو اس کا دشمن وہ میرا دشمن۔"

اور دونوں نے گھبرا کر تصدیق کر دی تو فاطمہؑ نے اعلان کر دیا، خدا و ملائکہ شاہد ہیں کہ تم لوگوں نے مجھے ناراض کیا، میں بابا سے تمھاری شکایت کروں گی[2]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فاطمہؑ نے اپنے اعتراض کو مستحکم کرنے کے

---

[1] صحیح بخاری ج ۵ ص ۲۴۵، صحیح مسلم ج ۴ ص ۱۶۱، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۵۴، ذخائر العقبیٰ ص ۳۹، صواعق محرقہ ص ۱۰۴، مسند احمد ج ۴ ص ۳۲۳، ترمذی ج ۲ ص ۳۱۹، ابن ماجہ ج ۱ ص ۲۱۶

[2] صحیح بخاری ج ۵ ص ۵، ج ۶ ص ۱۹۶، مسلم ج ۲ ص ۷۲، مسند احمد ج ۱ ص ۶، تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۰۲، کفایت الطالب ص ۲۲۶، سنن بیہقی ج ۶ ص ۳۰۰

لیے کس قدر اہتمام کیا تھا تاکہ اس نزاع سے ایک دائمی نتیجہ حاصل کریں۔ تاکہ افکارِ فاطمی کی وضاحت ہو جائے اور ان کے نظریات معلوم ہو سکیں۔

فاطمہؑ کا اعتقاد یہ تھا کہ میرا حاصل کردہ نتیجہ دین و عقیدہ کے حساب میں بڑا قیمتی ہے اور وہ یہ کہ صدیق مستحق غضبِ الٰہی و غضبِ رسولؐ ہیں انھوں نے خدا و رسولؐ کو اذیت دی اور ان کو ناخوش کیا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا انسان مستحقِ خلافت و امامت ہرگز نہیں ہو سکتا۔

قرآن کہتا ہے:

"مسلمانو! تمھیں خدا و رسولؐ کو اذیت دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جو لوگ خدا و رسولؐ کو اذیت دیتے ہیں وہ دنیا و آخرت میں مستحقِ لعنت ہیں، جو رسولؐ کو اذیت دے وہ مستحقِ عذابِ الیم ہے۔"

"اے اہلِ ایمان! ان کو ولی نہ بناؤ جن پر اللہ کا غضب ہے، جن پر اللہ کا غضب ہے وہ گمراہ ہیں۔"

(۴)

اقتباساتِ کلامِ فاطمیؑ

عظمتِ پیغمبرؐ روحانی منازل میں

ہم اس مقام پر خطبۂ جناب فاطمہ زہراؑ کے چند اقتباسات نقل کر رہے ہیں تاکہ ان کی باقاعدہ تحلیل و توضیح کی جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اس کلام سے شہزادیٔ عالمؑ کا حقیقی مقصد کیا تھا؟

آپؑ فرماتی ہیں:

"اللہ نے پیغمبرؐ کو کمالِ شفقت و رغبت و ایثار کے ساتھ اپنے پاس بلا لیا۔ اب پیغمبرؐ کو تعبِ دنیا سے راحت مل گئی، ان کے گرد ملائکۂ ابرار، ان کے سر پر رحمتِ غفار اور ان کے جوار میں ملکِ جبار رہے۔"

ذرا دیکھو تو! اس مخدرہ نے کیوں کر تمام مادّی نعمتوں کا ذکر چھوڑ کر، فردوس باقی اور جنتِ خلد کا تذکرہ شروع کر دیا۔ مخدرہ یہ سمجھتی ہے کہ میرے باپ کی منزل، ان نعمتوں سے اجل وارفع ہے۔ لذتِ مادّی خواہ وہ کیسی ہی عظیم ہو اس

محمدؐ کی نظر میں جو روحانیت کا علمبردار تھا جس کی منزلِ کمال تک کوئی دوسرا انسان نہیں پہنچ سکتا، بالکل ہیچ ہے۔

فاطمہؑ کی تربیت اس مصلحِ اعظم کے ہاتھوں سے ہوئی جو عقیدۂ الٰہیہ کا حامل تھا۔ وہ عقیدۂ الٰہیہ جو فکری پرواز کی آخری منزل اور طوافِ انسانیت کا آخری دور ہے جہاں پہنچ کر ضمیر کو سکون اور روح کو دولتِ ایمان حاصل ہو جاتی ہے۔

رسولِ اکرمؐ! وہ روح کا مربی اور روحانیت کا قائدِ اعظم، جس کے جھنڈے کے سایہ میں روح نے مادّی قوتوں کو نیست و نابود کر دیا۔ جب محمدؐ اس میدان کا مجاہدِ اکبر ہے جہاں مادہ و روح کی فیصلہ کن جنگ ہوتی ہے تو پھر کیا تعجب ہے کہ محمدِ عربیؐ کو عالمِ روحانیت کا محور قرار دیا جائے اور افلاکِ روح کی گردش ان کے اشاروں پر مانی جائے جیسا کہ فاطمہ زہراؑ نے اظہار کیا کہ محمدِ عربیؐ کے گرد ملائکۂ رحمت جمع ہیں گویا کہ یہ ذات دنیا و آخرت میں قطب کی حیثیت رکھتی ہے۔

فرق یہ ہے کہ دنیا میں پریشانی ہے اس لیے ابھی حیاتِ انسانیت کی گردشوں کی اصلاح کر رہا ہے اور آخرت میں مطمئن ہے اس لیے ملائکہ استفادۂ نور اس مرکزِ انوار سے کرتے ہیں اور اس کے گرد جمع رہتے ہیں۔

جب پیغمبرؐ اس منزل کا انسان ہے تو اس کی جنت بھی ویسی ہی ہو گی وہاں مادی نعمتوں کا کیا ذکر ہو سکتا ہے، وہاں تو روحانی لذتیں اور پاکیزہ الطاف ہیں۔ اس سے بلند نعمت کیا ہو سکتی ہے کہ انسان ملکِ جبار کے ہمسایہ میں رہے اور اس کے سر پر سایۂ رضوانِ الٰہی چھایا رہے۔

اس طرح فاطمہؑ اپنے باپ کی جنت کو دو لفظوں میں بیان کر دیتی ہیں یہ وہ قطب ہے جو مبدارِ انوار سے متصل ہے اور یہ وہ آفتاب ہے جس کا ملائکۂ نور احاطہ

لے یہ فقرہ میں نے اپنی کتاب "العقیدۃ الالٰہیۃ فی الاسلام" سے نقل کیا ہے۔

کیے ہوئے ہیں۔

پھر فرماتی ہیں:

" تم جہنم کے دروازے پر تھے، ہر پیاسے کی نظر تم پر تھی اور ہر طماع کا لقمہ تم تھے، لوگ تمھیں اپنے پیروں سے کچلتے تھے تم گندہ پانی پیتے اور پتے چباتے تھے، تمھاری زندگی ذلت و خواری کی تھی۔ ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ تمھیں گھیر کر ہلاک کر دیں۔ اللہ نے تمھیں ان مصائب سے محمدؐ عربی کے ذریعہ نجات دی۔ ان باتوں کے علاوہ جب پیغمبرؐ، جانور جیسے انسان اور بھیڑیے جیسے عربوں میں مبتلا ہو گیا جن میں سرکش قسم کے اہل کتاب بھی تھے جن کی آتش فساد کو اللہ نے کبھی بھڑکنے نہیں دیا جب کبھی شیطان نے سر ابھارا یا مشرکین نے کوئی بے ادبی کی تو پیغمبرؐ نے اپنے بھائی کو سینہ سپر کر دیا جس کی شان یہ تھی کہ جب تک فتنوں کے کان نہ بند کر دے اور جب تک آتش فساد کو اپنی تلوار کے پانی سے خاموش نہ کر دے میدان سے پلٹتا نہ تھا۔ وہ ذاتِ خدا میں کوشاں، امر الٰہی میں جدوجہد کرنے والا، رسول اللہؐ سے قریب، اولیاء خدا کا سردار، امت کا ناصح، عمل کے لیے کمر بستہ، اسلام کے لیے ساعی اور ترویج دین کے لیے جفاکش تھا۔ ان تمام شدائد میں تم فارغ البال اور مطمئن تھے۔ تم کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔" [1]

---

[1] اس کلام سے فاطمہ زہراؑ کی مراد اس وقت کی حاکم جماعت ہے جیسا کہ ہم آئندہ واضح کریں گے۔ (مترجم)

فاطمی موازنہ امامؑ واغیار کے درمیان

کیا عجیب مقابلہ ہے اس شخصیت کے درمیان جس کو فاطمہ زہراؑ نے دنیائے اسلام کی قوتِ عسکریہ[1] کا ماحصل قرار دیا ہے اور اس کے درمیان کہ جو ملکۂ شجاعت اور عسکری قوت سے کلی طور پر عاری تھا ——— اس مقدس ذات کے درمیان جس کی شجاعت کے نعرے آسمانوں[2] میں لگائے گئے، جس کے کارنامے فہرست مثالیات میں دوامی حروف سے لکھے گئے اور اس شخصیت کے درمیان جو میدان جہاد سے الگ رہ کر ہمیشہ عریشہ[3] میں پناہ گزین رہے اور کاش اتنا ہی ہوتا اور وہ فرار اختیار نہ کیا جاتا جو قربانی اور آدابِ فداکاری کے میدانوں میں حرام وناجائز قرار دیا گیا ہے۔

ہم نے تاریخ انسانیت میں اس نجم صحابیت کا کوئی کارنامہ ایسا نہیں دیکھا جو قابل ذکر ہو، برخلاف میدان جہاد میں علوی کارناموں کے، اس لیے کہ امامؑ کے مواقف میدان جہاد وقتال میں ایسے ہیں جنھیں دنیائے اسلام اپنا مرکز اور تاریخ مذہب نے اپنی سرخی قرار دیا ہے۔

علیؑ تاریخ نبوت کے لحاظ اوّل کا مسلم اوّل ہے۔ اس وقت جب صوتِ رسالت دہن پیغمبرؐ سے نکلی اس کے بعد علیؑ ہی وہ جسور اور مجاہد ہے جس کے حوالہ کفار سے تصفیۂ حساب آسمان کی طرف سے کیا گیا۔

---

[1] تاریخ کا یہ فقرہ نہایت ہی معروف ہے "استوی الاسلام بسیف علیؑ" اسلام علیؑ کی تلوار سے غالب ہوا ہے۔

[2] لافتیٰ الا علی، کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ (مترجم)

[3] جن مورخین نے خلفاء وقت کے فرار سے دامن بچانا چاہا انھوں نے اتنا ضرور اعتراف کیا ہے کہ یہ لوگ رسول اکرمؐ کے ساتھ ایک محفوظ جگہ پر پناہ گزیں رہتے تھے۔

استحقاقِ خلافت کے بارے میں امامؑ کی کامیابی دو جہتوں سے ہے۔

(۱) ——— یہی وہ بے مثل سپاہی ہے جس نے جملہ مسلمانوں کے آگے میدانِ جہاد میں اس وقت قدم جمائے جب میدانِ جہاد کو سیاسی مرکزیت سے الگ نہیں کیا گیا تھا۔

(۲) ——— امامؑ کا بے مثل جہاد اس اخلاص کی کامل دلیل ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور حرارتِ ایمانی کا یہی وہ بھڑکتا ہوا شعلہ ہے جو تا قیامت خاموش نہیں ہو سکتا۔ اخلاصِ کامل اور حرارتِ ایمانی یہ دو بنیادی شرطیں ہیں اس شخصیت کے لیے جو مسندِ حکومت پر بیٹھ کر امتِ اسلامی کی حفاظت کا دعویدار رہے۔

آپ حیاتِ رسولؐ اور جہادِ رسولؐ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ علیؑ ہی کی وہ ذات ہے جس نے اپنی مواسات سے زمین و آسمان کو مدہوش کر دیا[۱]۔ اور صدیق ہی کی وہ

---

[۱] تاریخ طبری میں ابن رافع سے منقول ہے کہ جب علیؑ ابن ابی طالب علمبرداروں کو تہ تیغ کر چکے تو رسولِ اکرمؐ نے ایک جماعتِ مشرکین پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ علیؑ نے انھیں بھی قتل کر دیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے دوسری جماعت پر حملہ کا حکم دیا۔ علیؑ نے اسے بھی فی النار کیا تو جبرئیل نے آکر عرض کی، یا رسول اللہؐ! یہ مواسات ہے۔ آپ نے فرمایا، کیوں نہ ہو وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ جبرئیل بول اٹھے اور میں آپ دونوں سے۔ **لافتیٰ الّا علی لاسیف الّا ذوالفقار۔**

آپ ذرا غور کریں کہ پیغمبرؐ نے مواساۃ سے وحدت کی طرف کس طرح توجہ فرمائی۔ اس لیے کہ مواساۃ تعدد اور دوئی پر دلالت کرتی ہے۔ پیغمبرؐ نے چاہا کہ مجھ میں اور علیؑ میں تعدد اور دوئی رہے اس لیے اپنا جزء بنا لیا تاکہ دنیائے مواساۃ تا قیامت علیؑ کے کردار کو شمع راہ اور مثال انسانیت اور معراجِ ارتقاء قرار دیتی رہے۔ اب اس کے بعد بتائیں کہ کیا انصاف یہی ہے کہ جسے پیغمبرؐ اپنا جزء قرار دیں اس کے اور پیغمبرؐ کے درمیان تین اجنبی اشخاص کا فاصلہ قرار دے دیا جائے۔

ذات ہے جس نے اس مرکز قیادت میں پناہ لی جو متعدد پہلوانوں کے حلقہ میں گھرا ہوا تھا۔[1]
اور یہی وہ شخصیت[2] ہے جس نے روز احد، فاروق[3] کے ساتھ فرار اختیار کیا اور دست پیغمبرؐ
پر موت کے لیے بیعت نہیں کی۔

تاریخ مسلمین[4] بتاتی ہے کہ شہادت کے لیے دست رسولؐ پر آٹھ
آدمی، ۳ مہاجر اور ۵ انصار نے بیعت کی تھی لیکن ان میں کہیں اس بلند شخص کا پتہ[5] نہیں ملتا۔

سوال یہ ہے کہ اگر حضور نے فرار اختیار نہیں فرمایا تو بیٹھے کیوں رہے؟ جب کہ
جہاد اس وقت تک واجب رہتا ہے کہ جب تک دشمن کے مقابلہ کی پوری قوت جمع نہ ہو
جائے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ ورنہ پیغمبرؐ اس قدر زخمی نہ ہوتے کہ بیٹھ کر نماز ادا
کریں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وسط میدان اور عرصۂ جنگ میں آنے والا موت سے
نجات حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ دو میں سے ایک راہ اختیار نہ کرے۔

یا فرار کرے یا سب کے ساتھ دفاع کرے۔

اگر صدیق نے ان میں سے کوئی کام نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک
دشمن دوسرے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہا اور اسے کسی نے قتل نہ کیا۔ کیا یہ کہا جائے
کہ مشرکین رسولؐ و علیؑ وغیرہ سے نہ ڈرے اور صدیق سے ڈر گئے؟

میری سمجھ میں یہ فلسفہ نہیں آتا۔ سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے
کہ صدیق نے جوار رسولؐ میں کھڑے ہو کر ایسی جگہ حاصل کر لی کہ جو خطرہ کے مقامات سے

---

[1] عیون الاثر ج ۱ ص ۲۵۸
[2] تاریخ اہل تشیع
[3] شرح نہج البلاغۃ ج ۳ ص ۳۸۹، ۳۹۰
[4] شرح نہج البلاغۃ ج ۳ ص ۳۸۸
[5] شرح نہج البلاغۃ ج ۳ ص ۳۸۹

بقدر حاجت دُور تھی اس لیے کہ مجاہدین کی ایک جماعت اس کی حفاظت میں مشغول تھی۔

یہ بات کچھ بعید نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہم نے مذاقِ صدیق سے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں رسولؐ کے پہلو میں رہنا زیادہ پسند کرتے تھے، اس لیے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں جنگ کی تکالیف سے محفوظ رہنے کے اسباب مہیا رہتے تھے۔

آپ حیاتِ امامؑ اور حیاتِ صدیق کا مطالعہ کر کے ہمیں بتائیں کہ کیا حیاتِ امامؑ میں کسی مقام پر اخلاص کی خاموشی، جذبہ قربانی کی کمی اور میدانِ جنگ میں راحت طلبی[1] کی تلاش نظر آتی ہے؟ خوب دیکھ لیجیے، باقاعدہ نظر کیجیے!

انشاءاللہ ہر کارنامہ ایک دوسرے سے بہتر اور ہر قربانی دوسری سے مافوق پائیں گے ـــــــــــ! یہ وہ شخصیت ہے جہاں باطل کا گزر نہیں، اس میں دوام و فکر کی اتنی ہی استعداد پائی جاتی ہے جتنی اس کے استاد محمدؐ عربی میں۔ اس لیے کہ یہ اس کا نفس ہے[1]

اب زمانۂ رسولؐ میں صدیق کی زندگانی ملاحظہ کریں۔ کیا اس میں سوائے ضعفِ عقیدہ اور ترکِ جہاد کے کچھ اور نظر آتا ہے؟

کبھی عریش میں پناہ گزین اور کبھی پہاڑ[2] پر اچکتے نظر آئیں گے کبھی اسامہ کے لشکر[3] سے جدا ہو کر پیغمبرؐ کے مقرر کردہ امیر کی مخالفت کرتے دکھائی دیں گے

---

[1] اس کی واضح دلیل آیۂ مباہلہ ہے۔

[2] سیرۃ حلبیہ ج ۳ ص ۱۲۳ جس میں ثابت قدم رہنے والوں میں آپ کا اسم شریف نہیں ہے، رہ گیا فرارِ عمر، تو اس پر صحیح بخاری کی روایت دال ہے جس کا راوی جنگِ حنین کا ایک فراری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عالمِ فرار میں میں نے عمر کو دیکھا۔ پوچھا مسلمانوں کا کیا حشر رہا فرمایا: اللہ مالک ہے۔ یہ واضح دلیل ہے کہ آپ فراریوں میں تھے۔

[3] سیرت حلبیہ ج ۳

کبھی خیبر میں بجائے فتح قلعہ قموص، ہزیمت خوردہ نظر آئیں گے جس کی داد شجاعت[1] ان کے وزیر اعظم حضرت فاروق دیں گے اور مسلمانوں کو بزدلی پر آمادہ کریں[2] گے۔ یہاں تک کہ پیغمبرؐ کو کہنا پڑے گا:

"کل میں علم دوں گا ..... الخ"

اور اس کلام سے ایک ایسی تعریض ظاہر ہوگی جس سے ہزیمت خوردہ[3] شخص کے حواس اڑ جائیں گے اور علیؑ عظیم کی وہ شخصیت نمایاں ہوگی جو محب خدا و رسولؐ اور محبوب خدا و رسولؐ ہے[1]۔ (ملاحظہ ہو صحیح بخاری ج ۵ ص۱۸ مسند احمد ج ۵ ص۳۵۳)

اے مسلمانوں کے دونوں خلیفہ!

کیا تمہارا پیغمبرؐ جس کی نیابت کے تم مدعی ہو وہ بھی ایسا ہی تھا؟
کیا تم نے پیغمبرؐ سے جہاد اور راہ خدا میں قربانی کے درس نہیں حاصل کیے؟

کیا اتنی مدت تک صحبت پیغمبرؐ میں رہنے کے بعد بھی تم میں کوئی جذبہ ایسا نہ پیدا ہوا جو تمہیں فرار سے روکتا؟

کیا تم نے قرآن نہیں سنا جس نے تمہارا فریضہ حفاظت پیغمبرؐ اور نشر احکام اسلامی قرار دیتے ہوئے کہا ہے:

---

[1] مسند احمد ج ۵ ص۳۵۳، مستدرک حاکم ج ۳ ص۳۷، کنزالعمال ج ۶ ص۳۹۳

[2] یہ ہے مکمل تصویر شجاعت حضرت فاروق اعظم کی جن سے اسلام کی عزت وابستہ تھی۔

[3] میرا خیال ہے کہ وہ لشکر جو علیؑ کے ساتھ گیا تھا یہ وہی سابق ہزیمت خوردہ لشکر تھا اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائد لشکر کی شخصیت کا لشکر پر کتنا اثر پڑتا ہے۔ وہ فوج جس کی کمزوری کا کل فاروق نے اعلان کیا تھا آج اسی میں وہ پہلوان نکل رہے ہیں جن کے قدم میدان سے اکھڑتے ہی نہیں۔ صرف اس لیے کہ قائد کے ثبات قدم نے ان کے اجسام میں روح استقلال و استقامت پھونک دی ہے۔

"جو میدان سے بلا ضرورت بھاگ جائے اس پر غضب
خدا ہے اور وہ شخص جہنمی ہے۔"

شاید آپ یہ کہیں کہ صدیق وفاروق کا مقام اس سے بلند ہے کہ وہ فرار اختیار کریں۔ شاید انھوں نے کوئی عذر پیدا کر لیا ہو، اس لیے کہ ان کے اختیار میں تاویل کی گنجائش بہت زیادہ تھی جیسا کہ خالد ابن ولید کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو عمداً قتل کیا۔ اور صدیق نے کہہ دیا، یہ ایک اجتہادی غلطی ہے۔

ہم اس عذر کو قبول کیے لیتے ہیں اگر ہمارے سابقہ بیان کردہ واقعات قبولِ عذر کی اجازت دیں۔ (ملاحظہ ہو تاریخ ابن شحنہ برحاشیہ کامل ج ۱۱ ص ۱۱۴)

اعلانِ فاطمی سیاستِ وقت کے متعلق

جنابِ فاطمہ زہراؑ فرماتی ہیں:

"تم ہمارے شدائد کے منتظر اور ہمارے اخبار کے متلاشی تھے۔"

اس خطاب کا رخ حاکم وقت جماعت کی طرف ہے۔ اس لیے کہ اسی نے وہ خیال قائم کیا تھا جس پر فاطمہ زہراؑ نے تنقید کی ہے اور وہ ہے بیعت میں جلد بازی کا عذر خوفِ فتنہ۔

یہ خطاب اس جماعت کے لیے ایک صریح اتہام ہے کہ یہ لوگ حکومت کے خواہاں اور جویا تھے۔ اور اسی کے لیے برابر تدبیریں کیا کرتے تھے اور ایسے راستے معین کر رہے تھے جو مطلب تک پہنچا دیں اور ایک ایسے وقت کے منتظر تھے کہ جس میں تختِ خلافت پر قابض ہو کر بیتِ ہاشمی کو اس کے منصبِ قدیمی سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیں۔

ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ صدیق، فاروق اور ابو عبیدہؓ میں خفیہ سازش تاریخی شواہد کی بنا پر مسلمات میں سے ہے۔ ہم اپنے مقصد پر کلام معصومۂ سے بہتر کوئی دلیل نہیں چاہتے، اس لیے کہ وہ اس دور کی معاصر ہیں۔ وہ حوادث وقت کو ان نقاد اور مبصرین سے بہتر سمجھ سکتی ہیں جو کہ ہزار ہا سال کے بعد دنیا میں تاریخی افسانوں پر اپنی تحقیقات کی بنیاد قائم کریں گے۔

حق یہ ہے کہ اگر علیؑ کو الگ کر دیا جائے تو بظاہر اس حزب حاکم کا انکشاف سب سے پہلے فاطمہؑ نے کیا ہے اور انھیں نے اس کو خواہش سلطنت سے متہم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ان کے معاصرین امیرالمومنین و معاویہ بن ابوسفیان وغیرہ میں جرأت اظہار پیدا ہوئی۔

جب تک یہ جماعت جس کے وجود کا فاطمہؑ کو یقین ہے اور جس کی طرف امامؑ اور معاویہ نے اشارہ کیا ہے تخت حکومت اور امور امت پر قابض رہے گی اور جب تک بعد میں آنے والی نسلیں اسی اصول سیاست کو اپنی حکومت میں صرف کریں گی اور اسی متہم پارٹی کو اپناتی رہیں گی جس نے دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کر دیا ہے، اس وقت تک ہم تاریخ میں اس جماعت کی صحیح تشکیل کا پتہ نہیں لگا سکتے جس کی پشت پر کام کرنے والے بڑے بڑے مفکر لوگ تھے جن کا مشغلہ یہ تھا کہ وہ حکومت کے کردار کو شرعی رنگ میں رنگ دیا کریں۔

لے مجھے ابو عبیدہ معاف فرمائیں کہ میں نے انھیں کسی لقب سے یاد نہیں کیا اور یہ میری خطا نہیں ہے بلکہ اس اجل کی ہے کہ جس نے ان تک خلافت نہ پہنچنے دی۔ ورنہ انھیں بھی لوگ کسی نہ کسی لقب سے سرفراز ضرور کرتے۔ رہ گیا ان کا معروف لقب امین، تو یہ انھیں نہ ہی پیغمبرؐ کی جانب سے ملا اور نہ ہی عامۃ الناس کی جانب سے بلکہ یہ لقب انھیں خود ان کی اپنی پارٹی نے دیا تھا۔

تصریح صدیقہؑ
خلافت ابوبکر اور فتنہ کبریٰ کے متعلق

آپؑ فرماتی ہیں :

" تم نے غیر کے اونٹ کو نشان لگا دیا اور دوسرے کے چشمہ پر وارد ہو گئے۔ حالانکہ ابھی زمانہ قریب کا ہے اور زخم کشادہ ہے، جراحت کا اندمال نہیں ہوا، رسولؐ دفن نہیں ہوئے۔ جلدی صرف خوفِ فتنہ کے نام پر کی گئی حالانکہ تم فتنہ میں واقع ہو گئے اور جہنم تو کفار پر بہرحال محیط ہے۔"

" یہ سب تدبیریں دودھ کے لیے کی گئیں جو آخر کار خون بن گیا۔ اور یہی عین خسارہ ہے۔ اب تابعین کو ان کے پیشواؤں کے کرتوت کا علم ہوگا، اب خوب خوش ہو، عنقریب تم پر چمکتی تلوار، امنڈتی مشکلات، بے پناہ استبداد کا غلبہ ہوگا جو تم کو تباہ و برباد کر دے گا۔ افسوس صد افسوس تمھارے حال پر۔"

اگر صدیقؑ اور ان کے ساتھی ایک خاص قسم کا گروہ بنا بھی رہے تھے تو ہمیں ان سے اس امر کی امید نہیں تھی کہ وہ اس کے خطوط نمایاں کریں گے یا اس کے نتائج کا کوئی اعلان کریں گے لیکن اس کے باوجود ہمیں ان نتائج کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اتنا ضرور دیکھا گیا ہے کہ روزِ سقیفہ ان لوگوں نے بیعت میں بڑی جلد بازی سے کام لیا، اور

۱؎ اس بیان میں اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ تم نے اس خلافت پر قبضہ کر لیا کہ جس کے تم حقدار نہیں تھے۔ اور ظاہر ہے کہ دوسرے کے حق کو غصب کر لینے سے بڑا فتنہ کیا ہو سکتا ہے؟ (مترجم)

سلطنت کے لیے اسی طمع وحرص کا مظاہرہ کیا جس کی توقع اس وقت کے صحابۂ کرام سے نہ تھی۔ اس لیے کہ اس دور کے انسان دیندار و عاقل تھے جن کی فکر صرف رواجِ اسلام اور حفظِ شخصیتِ اسلامی سے متعلق تھی۔ ملکیتِ شخصی اور اقتدار پرستی جیسی باتیں تلامذہ محمدؐ عربی سے بہت بعید ہیں۔

حکام نے بھی اس امر کا احساس کیا کہ ان کی اپنی حرکتیں اصولِ اسلام سے بعید اور شانِ صحابیت سے بالکل بیگانہ ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں نے چاہا کہ اپنے کردار میں بلند مقاصد کا پیوند لگائیں اور فتنہ کے نام سے ان کی عیب پوشی کریں، لیکن انھیں یہ خیال نہ رہا کہ پیوند سے لباس رسوا ہو جاتا ہے اور بے ربط رفو کپڑے کو بدنما بنا دیتا ہے۔ اسی لیے فاطمہ زہراؑ نے اپنے دائمی کلمات سے اعلان کر دیا:

"یہ لوگ جس فتنے سے بچنے کے نام پر سب کر رہے ہیں اسی میں بالآخر گر پڑے، اور جہنم ان کا حقیقی مرکز ہے حقیقۃً یہ فتنہ ہے بلکہ ام الفتن ہے۔"

کیا کہنا تیری بلاغت کا اے بضعۃ النبیؐ!

تو نے ایک تلخ حقیقت کو بے نقاب کر دیا اور اپنے باپ کی امت کے سامنے اس وحشت ناک مستقبل کو پیش کر دیا جس میں سرخ بادل چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

میں کیا کہوں ــــــــــــ؟

اب تو خون کی ندیاں بہیں گی جس میں انسان ڈوبتے نظر آئیں گے اور فاطمہؑ سلفِ صالح سے اب مصائب کی فریاد یوں ہی کریں گی کہ:

"یہ لوگ فتنہ میں مبتلا ہو گئے اور ان کا انجام جہنم ہے۔"

اے شہزادی! یقیناً یہ فتنہ ہے بلکہ لاریب، ام الفتن ہے۔

اس سیاست کو کم از کم فاطمہؑ کی نظر میں تو فتنہ ہی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ اس ہارونِ محمدی کے خلاف چلی گئی ہے کہ جس کی ذاتِ گرامی میں حکومتِ اسلامی کے جملہ قوانین جلوہ گر نظر آتے ہیں[1]

عجیب مذاق ہے کہ؛

عمر اپنے کرتوت کا عذر خوفِ فتنہ کو قرار دیتا ہے اور اسے یہ خبر نہیں کہ خلافِ منشاء[2] خدا و رسولؐ حقدار سے خلافت چھین کر غیر مستحق کو دے دینا، یہ بھی ایک فتنہ ہے، بلکہ اس لفظ میں جتنا عظیم مفہوم پوشیدہ ہو سب کا مستحق ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ؛

اگر ان لوگوں کو فتنہ کا خوف تھا اور یہ حکومت کے طالب نہیں تھے، مگر اس مقدار میں کہ جو اسلام کے لیے مناسب ہو تو انھیں کس بات نے اس امر سے روک دیا تھا کہ رسول اکرمؐ سے خلیفہ کے متعلق سوال کرتے، یا ان سے خواہش کرتے کہ اپنے بعد کے لیے مرجع اعلیٰ مقرر کر دیں۔

حالانکہ پیغمبرؐ کا مرض الموت کافی دیر تک رہا اور آپ نے بار بار اپنی موت کی خبر بھی دی۔ بلکہ لوگوں نے غسل و کفن[3] کی ترتیب بھی پوچھی تھی۔

---

[1] جنھیں حدیثِ غدیر کہ جسے ۱۱۰ صحابہ ۸۴ تابعین اور ۳۵۳ مؤلفین اہلسنت نے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو "الغدیر" علامہ امینی" یہ یاد رہے کہ قرآن کے اکثر اجزا کے لیے اتنی روایات نہیں ہیں جتنی حدیثِ غدیر کے لیے ہیں۔ لیکن اس میں شک قرآن کے انکار کے مترادف ہے۔ البتہ رہی اس حدیث کی خلافت پر دلالت، تو اسے کتاب "مراجعات" علامہ عبدالحسین شرف الدین میں ملاحظہ فرمائیں۔

[2] شرح نہج البلاغۃ جلد ۳ صفحہ ۱۱۴-۱۱۵

[3] تاریخ ابن اثیر ج ۲ صفحہ ۱۲۲

کیا یہ مسئلہ کسی کے ذہن میں آیا ؟

کیا کسی کے دل میں یا حضرت عمر خائفِ فتنہ کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ ان فتنوں کے دفع کرنے کا کوئی حل معلوم کرلیں۔ جن کو خود رسولِ اکرمؐ نے شبِ تاریک سے مشابہ قرار دیا ہے ؟

حتیٰ کہ ادھر پیغمبرؐ کی روحِ اقدس نے قفسِ عنصری سے پرواز کی ادھر مسلمانوں کے احساسات اور ان کی اسلامی غیرت میں ہیجان پیدا ہوگیا اور ان کے دل خوفِ فتنہ سے بھر گئے۔

میرا تو عقیدہ ہے کہ :

ان میں سے کوئی بات نہ تھی۔ صرف بات یہ تھی کہ پیغمبرؐ سفینۂ اسلام کا ناخدا پہلے ہی مقرر کرچکے تھے، اسی لیے امت نے سوال کا کوئی محل نہ سمجھا۔

ان باتوں کو چھوڑنے اور نہ پوچھنے کے لیے جو عذر چاہے تراشیے لیکن اسے کیا کہا جائے کہ یہ اسلام کے غیور اصحاب، بجائے سوال کرنے کے، پیغمبرؐ اگر بیان بھی کرنا چاہتا ہے تو اسے روک دیتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ فتنہ بھی ایک گمراہی ہے جس کے دفع کے لیے پیغمبرؐ نے قلم و کاغذ طلب کیا ہے۔

کیا یہ کہا جائے کہ یہ لوگ صداقتِ رسولِ اکرمؐ میں شک کررہے تھے ؟ یا یہ کہا جائے کہ یہ لوگ تحفظِ اسلام اور خاتمۂ فسادات پر نبیٔ اسلامؐ سے زیادہ قادر تھے۔؟

میرا دل چاہتا ہے کہ میں ناظرین سے یہ سوال کروں کہ رسولِ اکرمؐ کی مراد ان فتنوں سے کیا تھی جن کا تذکرہ آخر عمر میں آنحضرتؐ نے بقیع میں مردوں سے خطاب کرکے فرمایا تھا۔ آپؐ فرماتے ہیں :

---

[1] العقد الفرید ج ۳ ص

"تم خوش قسمت تھے جو گزر گئے۔ اب وہ فتنے آ گئے
ہیں جو مثل شب ہائے تاریک سیاہ ہیں۔"[۱]

شاید آپ کہیں کہ اس سے مراد فتنۂ مرتدین ہے۔ میں اس بات کو قبول کر لیتا اگر مدفونین بقیع میں ارتداد کا احتمال ہوتا، حالانکہ یہ غیر ممکن بات ہے وہ صالحین اور متقین کی منزل ہے وہاں مرتدین کا کیا گزر؟ اگر وہ مراد نہیں تو پھر ان کی خوش قسمتی کیا ہے کہ وہ نہ رہے۔

ممکن ہے کہ کوئی خیال کرے کہ اس سے مراد وہ اموی چالیں ہیں جو عثمان و معاویہ نے اختیار کیں لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ خلاف منطق ہے اس لیے کہ یہ بدعنوانیاں تین ادوار کے بعد پیدا ہوئیں اور پیغمبرؐ یہ کہہ رہا ہے کہ فتنے آ گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو زمانۂ رسولؐ سے متصل ہونا چاہیے۔

اب کہیے دیکھیے کہ مراد پیغمبرؐ یہی فتنے ہیں جو بعد رسولؐ بلا فاصلہ پیدا ہوئے جن کو بقیع میں دفن ہونے والوں سے خاص ربط ہے اور یہی وہ فتنہ ہے جس کے متعلق فاطمہ زہراؑ نے فرمایا ہے کہ لوگ فتنے میں پڑ گئے۔

جب کسی شے کو رسول اکرمؐ فتنہ کہیں تو اب ہمارے لیے کیا مانع ہے کہ ہم اس امر کو دنیائے اسلام کا فتنۂ اوّل قرار نہ دیں۔

اس وقت کی کارروائی ایک دوسرے اعتبار سے بھی فتنہ تھی اور وہ یوں کہ خلافت ایک ایسی امت کے لیے طے کی گئی کہ جس میں کے چند معمولی افراد ہی اس سے راضی تھے جنھیں حکومت کے امور اور سلطنت کے دستور میں کسی قسم کا دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہوتا ہے۔

یہی خلافتِ صدیق ہے کہ جب وہ سقیفہ کے باہر نکلے تو عمر

---

[۱] تاریخ کامل ج ۲ ص۱۲۳

ان کے آگے آگے چل رہے تھے اور اس قدر چلا رہے تھے کہ منہ سے جھاگ نکلا آرہا تھا۔ ان کے ساتھ ایک جماعت تھی جو صنعانی چادریں اوڑھے ہوئے تھی۔ یہ جس کے پاس سے گزرتے تھے اسے مخبوط الحواس بنا کر اس کا ہاتھ کھینچ کر ابوبکر کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے چاہے وہ راضی ہو یا ناراض، اور یہی ان کی بیعت تھی۔[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ،

حکام نے مسلمانوں کے سامنے ایسی خلافت پیش کی کہ جو نہ آسمان سے بابرکت قرار پائی اور نہ اس سے مسلمان راضی ہوئے، نہ اس کی پشت پر نص رسولؐ تھی نہ اجماع امت۔

اس لیے کہ سعد نے تا حیات بیعت نہیں کی اور بنی ہاشم نے بقول بخاری چھ مہینے تک۔

کہا جاتا ہے کہ اہل حل وعقد کی بیعت کافی ہے۔

کیا یہ مفہوم محتاج شرح وتفسیر نہیں ہے؟

یہ کس نے کہا کہ ابوبکر کی بیعت کرنے والے اہل حل وعقد تھے ——؟ یہ استعداد ان میں کس نے پیدا کی ——؟

یہ کام نہ تو نبیؐ نے کیا اور نہ امت نے! اس لیے کہ تاریخ بتاتی ہے کہ اہل سقیفہ نے قوانین انتخاب کی رو سے ایسی جماعت کا انتخاب ہی نہیں کیا جس کو حاکم اعلیٰ کے انتخاب کا حق ہو اور اسے اہل حل وعقد سے تعبیر کیا جاسکے۔ نہ رسولؐ نے کسی جماعت کو یہ لقب دیا ہے! بھلا یہ مسلمانوں کے لیے کیسے جائز ہوگیا کہ امور امت پر کسی کو حاکم اختیار کریں۔ اس حالت میں کہ نہ انھیں خود چناؤ کا حق ہو اور نہ امت نے انھیں اس کام پر مقرر کیا ہو۔ کیا اسلام کا نظام حکومت یہی ہے؟

---

[1] شرح نہج البلاغۃ معتزلی ج ۱ ص۷۴

اصطلاحِ سیاست میں یہ بڑی پُرلطف بات ہے کہ :

حاکم خود ہی اہلِ حل وعقد مقرر کرے اور پھر ان سے خود ہی انتخاب کرائے۔ اس سے زیادہ لطیف یہ بات ہے کہ علیؑ وعباس و بنی ہاشم وسعد بن عبادہ و زبیرؓ عمار وسلمان وابوذر ومقداد اور جملہ اہلِ عقل ورائے (بقول ابن عباس۔ ملاحظہ ہو شرح نہج البلاغۃ معتزلی ج ۳ ص۱۱۵) کو اہل حل وعقد سے خارج کر دیا جائے (اگر یہ صحیح ہو کہ اسلام میں کوئی طبقہ اہلِ حل وعقد کا بھی ہے)

اس ایک کلمہ نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اسلام کو نظامِ اشتراکیت کا نمونہ بنا دیں۔ حالانکہ اس کو اسلام سے کوسوں کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔

حیف صد حیف !

کیا وہ بڑی بڑی دولتیں جن سے عبدالرحمٰن بن عوف اور طلحہ و زبیر کے خزانے بھرے ہوئے تھے ان کا کوئی سبب سوائے اس لقب کے کچھ اور بھی تھا۔

کیا یہی وہ مبارک لقب نہ تھا جس نے ان میں احساسِ برتری پیدا کر دیا اور انھیں یہ خیال دلا دیا کہ تم امتِ اسلامیہ کے جملہ اموال میں تصرف کے حقدار ہو ______؟

کہا جاتا ہے کہ حکومتِ شرعیہ کا معیار اکثریت ہے اور اسی قانون پر اساس حکومت کو قائم ہونا چاہیے۔

مگر لطف یہ ہے کہ قرآن کریم نے اکثریت کا بڑا استخفاف کیا ہے اور اس نے کسی حالت میں بھی اکثریت کو معیار و میزان نہیں قرار دیا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے :

"اے رسولؐ! اگر تم اکثر کا اتباع کرو گے تو یہ تمھیں گمراہ کر دیں گے۔"

اکثر حق کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اکثر خیالات کا اتباع کرتے ہیں۔ اکثریت جاہل ہوتی ہے۔

صحاح سنت میں رسول اکرمؐ سے روایت ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں:

"جب میں حوض کوثر پر کھڑا ہوں گا تو ایک جماعت آئے گی جسے میں پہچانتا ہوں گا۔ ایک شخص کہے گا کہ ان کی منزل جہنم ہے میں سوال کروں گا۔ کیوں؟ جواب ملے گا۔ یہ تمہارے بعد مرتد ہو گئے تھے۔ اب ان میں سے صرف چند اشخاص بچیں گے۔"

ظاہر ہے کہ اکثریتِ گمراہ، اسلامی سلطنت کی بنیاد نہیں قائم کر سکتی اس لیے کہ ایسی اکثریت کی خلافت بھی ایسی ہی ہوگی۔

اگر ہم اکثریت کو اہل مدینہ کی ایسی کثرت میں محدود نہ کریں بلکہ یہ کہیں کہ اکثریتِ مسلمین خلافت کا معیار ہے تو پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ کیا مدینہ ہی مسلمانوں کا مسکن تھا کہ وہاں کی اکثریت کی رائے حاصل کر لی گئی؟ یا ابوبکر نے خلافت کے لیے غیر مقامات پر خطوط لکھ کر ان کی رائے حاصل کی تھی؟

تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ پوری مملکت والوں پر خلافت کا تسلیم کرنا یوں فرض کیا گیا کہ اس میں کسی شک و انکار کی گنجائش ہی نہ رکھی گئی۔ اور نہ اس کا موقع دیا گیا کہ کوئی پوچھ سکے۔ بلکہ بیعت میں تردد کو ایک ناقابل مغفرت جرم قرار دیا گیا۔[۱]

کہا جاتا ہے کہ خلافت بعض مسلمین کی بیعت سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات ابوبکر کو میسر ہو گئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس بات کو کوئی عقلِ سلیم اور منطقِ صحیح تسلیم نہیں کرتی۔ بعض مسلمین کو کون سا حق ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کے سر کسی کو حاکم بنا کر مسلط کر دیں؟

بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جملہ امورِ امت ایسے کمزور دھاگے میں معلق کر دیے

---

[۱] جیسا کہ مالک بن نویرہ کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو "نص و اجتہاد" (مترجم)

جائیں جو کچا ہوا اور امت کو اپنے احکام و قوانین کے تحفظ کے لیے ایسے شخص کی طرف موڑ دیا جائے کہ جس کو چند آدمیوں نے بنا کر کھڑا کر دیا ہو ؟

جس عدالت کی تصدیق نہ کسی نص نبوی نے کی نہ اجماع قومی نے، بلکہ یہ ایک عوام کی جماعت جس میں بعض وہ بھی ہیں کہ جن کو قرآن نے سند دی ہے کہ یہ پیغمبرؐ کو اذیت دیتے ہیں۔

خدا اور رسولؐ سے عہد کرتے ہیں کہ اب اگر اس کا فضل ہو گیا تو ہم صدقہ دیں گے اور صالح بن جائیں گے۔ لیکن جب مل جاتا ہے تو بخل کرتے ہیں اور منہ پھیر لیتے ہیں آخر کار ان کے دلوں میں نفاق راسخ ہو جاتا ہے۔ یہ وعدہ کے مخالف اور کاذب ہیں۔

بعض وہ بھی ہیں جن کے باطن کی تعریف قرآن نے کی ہے :

"اہل مدینہ میں سے بعض وہ ہیں جو نفاق پر اڑے ہوئے ہیں، اے رسولؐ تم نہیں جانتے لیکن ہم تو واقف ہیں"۔

ظاہر ہے کہ ایسی جماعت جس میں کچھ منافق، کچھ موذی اور کچھ کاذب ہوں، ان کا انتخاب کرنا عامہ مسلمین کے لیے واجب العمل اور قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ خواہ انھوں نے کسی بنیاد پر انتخاب کیا ہو۔

اس سے بڑھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خلافت صدیق نہ خلافت نص تھی نہ اکثریت، نہ وہاں کوئی انتخاب ہوا تھا نہ اختیار۔ صرف اتنا ہے کہ اس کے پیچھے بعض لوگوں نے اپنی کوششیں صرف کیں۔ بعض نے اس کے گرد ہجوم کر لیا۔ مدینہ کی کچھ پارٹیوں نے ساتھ دے دیا اور اس طرح چند مسلمانوں کی ایک خلافت تیار ہو گئی جن کا قول اس موضوع میں قطعاً ناقابل اعتبار رہے۔ اس لیے کہ وہ حکومت جس کی قوتیں امت سے حاصل ہوں اس کا حاکم بھی پوری امت یا اس کی اکثریت کا نمائندہ ہونا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ

امت میں کچھ منافقین بھی ہیں جنھیں صرف قرآن جانتا ہے۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ اس اجتماع میں ایسا کوئی نہیں تھا تو اس کے لیے نص یا اجماع امت کی ضرورت ہو گی۔

اگر مجھے صدیق اجازت دیں تو میں فاطمہ زہراؑ کی رائے کی طرف کچھ یا پورا پورا میلان ظاہر کروں، اس لیے کہ میں اس سے بڑا کوئی فتنہ نہیں پاتا کہ ایک شخص بلا وجہ قانونِ امت پر مسلط ہو جائے اور اس کے دستورِ حیات میں تصرف شروع کر دے، جیسا کہ صدیق نے اپنی پوری خلافت میں یا کم از کم عشرۂ اوّل میں یا پھر ہفتۂ اوّل میں کیا جس کی تعبیر صدیقہ نے فتنہ سے کی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ وہ لوگ، جنھوں نے ان عناصر کو چھوڑ کر جنھیں اس موضوع میں واقعی رائے دینے کا حق تھا اپنی استبدادی خلافت بنالی تھی۔ ان کے ذہن میں یہ بات آئی تھی یا نہیں کہ

یہ عناصر معارض ہوں گے، بنی ہاشم مقابلہ کریں گے۔

حالانکہ یہ بات بڑی حد تک معقول تھی، پھر ان لوگوں نے کیونکر احتیاط نہیں کی؟

ہم کیوں نہ اس موقفِ عظیم کی ویسی ہی تعریف کریں جیسی کہ فاروق نے اس وقت کی جب انھوں نے فرمایا کہ اب ایسا اقدام کرنے والا مستحقِ قتل و موت ہے۔

اگر ہم اس کلام کو یہ خیال کر کے کہ ایک قائدِ امت کا قول ہے اس کی تحلیل کریں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ فاروق کی نظر میں خلافتِ صدیق فتنہ و فساد تھی اس لیے کہ قتلِ مسلم بغیر ان امور کے ناجائز ہے، بلکہ یہ فتنہ ام الفتن ہے کہ جس نے سلطنتِ الٰہیہ

کو ہر نیک و بد، صالح و ظالم کے حوالہ کر دیا۔
جیسا کہ حضرت عائشہ نے جو اس حاکم جماعت کی نمائندہ اور
ترجمان تھیں کہا کہ :

"یہی وہ فتنہ ہے جس نے طمع و حرص، ہوا و ہوس
کا وہ میدان قائم کر دیا جس میں مختلف جماعتیں اور متعدد
سیاستیں پیدا ہوئیں، مسلمانوں میں افتراق اور اجتماعِ اسلامی
میں ایسا انقسام پیدا ہو گیا کہ جس سے اس کا اسلامی وقار
ہمیشہ کے لیے ان سے رخصت ہو گیا۔"[1]

آپ کیا خیال کرتے ہیں اس امت کے بارے میں جس نے
چوتھائی صدی میں اسلام کی عظیم ترین حکومت قائم کر دی، صرف اس خاموشی کے نفدق
میں جو علیؑ نے اختیار کی، جس نے حکومت کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا اور حکام کو آگے
بڑھنے کا موقع دیا۔
آپ ایسی امت کا کیا وقار اور اس کی دنیا میں کیا عظمت سمجھتے ہیں ؟
یہ رائے اس وقت قائم کیجیے،
جب آپ کے دل میں ان سلاطین کی محبت نہ ہو جن کا کام
ضرر رسانیٔ امت، جن کا مشغلہ شراب و کباب، جن کی زندگی جنگ و جدل تھی۔
جنھوں نے تاریخِ اسلام کے چہرے کو اپنے کردار سے بدنما
بنا دیا اور امت کے پورے وقار کو کھو دیا۔
افسوس کہ صدیق و فاروق نے صرف اپنے زمانے کا مطالعہ

---

[1] درِ منثور ج ۲ صفحہ ۱۹

کیا اور یہ سمجھے کہ میری خلافت دستورِ اسلامی کی حمایت کرے گی۔

کاش!

وہ مستقبل پر بھی ایک نظر ڈالتے تو انھیں وہی خطرات نظر آتے جنھیں فاطمہ زہرا چشمِ معرفت سے دیکھ رہی تھیں۔

اور ـــــــــ

جن سے فاطمہ امتِ اسلامیہ کو آگاہ کر رہی تھیں۔

(۵)

مقدمۂ فدک

خلیفہ اپنی ردّ میں

مسئلۂ اوّل :۔ اگر ہم اپنی بحث کو ایک حد تک دقیق بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں علمی بحث کے قوانین پر دو باتوں کو پرکھنا پڑے گا۔ میراثِ فاطمہؑ کے مقابلہ میں خلیفہ کا موقف، جس میں انھوں نے اپنی اس حدیث پر اعتماد کیا تھا جو انھوں نے اس موضوع میں مختلف اسلوب اور متعدد اشکال کے ساتھ پیش کی۔

زمانۂ حاضر میں بھی وہ روایت نقل کی جاتی ہے لیکن مختلف عبارتوں کے ساتھ اور متعدد شکلوں میں۔ یا اس لیے کہ خلیفہ نے مختلف موقعوں کی مناسبت سے الفاظ میں تبدیلی پیدا کر دی تھی یا اس لیے کہ روایت ہی پیغمبر اسلامؐ سے متعدد الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔ اس مسئلہ میں چند امور قابل غور ہیں :

(۱)

یہ دیکھنا ہے کہ جس حدیث سے خلیفہ نے بنت رسولؐ کو ترکۂ نبوت سے محروم کر دیا اس پر خود انھیں کتنا اعتماد تھا۔ روایت یہ بتاتی ہے کہ ابوبکر نے صدیقہ کو

فدک دے دیا تھا لیکن درمیان میں عمر آگئے اور کہا کہ مسلمان کیا کھائیں گے ؟ اور یہ کہہ کر قبالۂ فدک کو پارہ پارہ کر دیا۔[1]

ہم اس روایت کو ایک حد تک مان لیتے ہیں، اس لیے کہ اگر اسمیں کچھ قوت نہ ہوتی تو اس وقت کے حالات اسے ہرگز نہ بیان ہونے دیتے اور اگر یہ حدیث صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ یہ داستانِ قبولیت حضرت فاطمہؑ کے خطبہ اور ابوبکر کی حدیث دونوں کے بعد کی ہے۔ اس لیے کہ مرتدین کی جنگ کہ جس کے لیے عمر کو سرمایہ کی ضرورت تھی سقیفہ کے دس[2] دن کے بعد سے شروع ہوئی اور اس طرح خطبۂ فاطمہ زہرؑا بھی دسویں دن کا واقعہ ہے۔

(۲)

خلیفہ نے وقتِ وفات، فاطمہؑ کو فدک نہ دینے پر ندامت کا اظہار کیا تھا[3]۔ بلکہ ایک وقت تو اس قدر متاثر ہو گئے تھے کہ خلافت سے استعفیٰ دے رہے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کے دل میں ایک عجیب اضطراب تھا جس کا سبب یہ احساس تھا کہ ہم نے فاطمہؑ کے فیصلے میں غلطی سے کام لیا ہے اور جس مدرک پر اعتماد کیا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے۔

یہ بات اکثر ان کے دل میں ہیجان پیدا کرتی تھی جس سے سکون کا کوئی ذریعہ انھیں نہ ملتا تھا۔ یہاں تک کہ پیمانۂ برداشت لبریز ہو گیا اور وقتِ آخر انھیں اس اضطراب و قلق کا اظہار ندامت کی شکل میں کرنا پڑا۔

۱؎ سیرۃ حلبیہ ج ۳ ص ۳۹۱

۲؎ مروج الذہب ج ۳ ص ۱۹۳

۳؎ سمو المعنی فی سمو الذات شیخ عبداللہ العلائلی ص ۵۱

(۳)

یہ ایک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے کہ ابوبکر نے جوارِ رسولؐ میں دفن ہونے کی وصیت کی تھی اور یہ بات اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتی جب تک کہ اپنی روایت کے اعتبار سے دست بردار نہ ہوجائیں جس کو انھوں نے قانونی مدرک قرار دیا تھا اور اپنی دختر سے اجازت نہ لے لیں کہ جس کے حصۂ میراث میں دفن ہونا چاہتے ہیں (اگر زمین کی میراث زوجہ کو ملتی ہو اور عائشہ کا حصہ اس قدرِ طویل کے لیے کافی ہو)

ورنہ اگر ان کی یہ رائے باقی رہی کہ ترکۂ نبیؐ صدقۂ مسلمین ہے تو انھیں تمام مسلمانوں سے اجازت لینے کی ضرورت تھی اور اگر یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ انھوں نے بالغین سے اجازت لے لی ہوگی تو سوال یہ ہے کہ نابالغ اور قاصرین کے حقوق ان کے لیے کس نے مباح کردیے؟

(۴)

ہماری بحث اور موقفِ خلیفہ

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ خلیفہ نے ازواجِ نبیؐ سے ان کے وہ مکانات نہیں سلب کیے جن میں وہ حیاتِ نبیٔ اکرمؐ میں سکونت پذیر تھیں۔

کوئی بتائے کہ آخر یہ تفریق کیوں؟

فاطمہؑ کا مال تو لے کر مصالحِ مسلمین میں صرف کیا جائے اور ازواج کو ان کے اموال میں مطلق العنان قرار دیا جائے۔ یہاں تک کہ عائشہ سے دفن کی اجازت لی جائے؟

کیا حکمِ عدمِ وراثت فقط بضعۃ النبیؐ سے مخصوص تھا؟ یا ازواج کے مکانات انھیں بطورِ عطیہ ملے تھے؟ اگر ایسا ہے تو اس پر خلیفہ کے پاس کیا دلیل تھی۔؟

حالانکہ نہ کسی نے دعویٰ کیا اور نہ گواہی دی۔

اور ظاہر ہے کہ حیاتِ رسولؐ کا قبضہ دلیلِ ملکیت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ وہ قبضہ زوجیتِ پیغمبرؐ کی وجہ سے تھا۔ جیسے کہ شوہر و زوجہ کی شان ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن میں مکانوں کی نسبت ازواج کی طرف دلیلِ ملکیت نہیں ہے اس لیے کہ نسبت کے لیے معمولی مناسبت بھی کافی ہے۔ جیساکہ قرآن نے چند آیات کے بعد انھیں مکانات کو رسولؐ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

اگر ترتیبِ قرآنی حجت ہے تو یہ آیت بھی دلیل ہے۔ مکانات کی نسبت ازواج کی طرف فقط سکونت کی بنا پر تھی نہ کہ ملکیت کی بنا پر۔ اس کے علاوہ صحاح اہلسنت میں بیت کی نسبت پیغمبرؐ کی طرف بکثرت ملتی ہے۔

"میرے بیت و منبر کے درمیان ایک باغِ جنت ہے۔"[1]

(۵)

ہم یہ پوچھتے ہیں کہ عدمِ میراث کا قانون اگر وحی الٰہی ہے تو اسے پیغمبرؐ نے کیوں نہیں بیان کیا؟ اور یہ صرف جنابِ فاطمہؑ پر کیوں جاری کیا گیا؟ باقی انبیاء نے یہ حکم کیوں نہیں لگایا؟

یا یہ کہ انبیاء نے اس حکم کو صرف اس لیے نہیں بیان کیا کہ مالِ دنیا ان کی اولاد میں محفوظ رہے؟

یا یہ کہ انبیاء نے اس پر عمل کیا لیکن تاریخ نے اس کا ذکر نہیں کیا؟

یا یہ ——— کہ یہ حکم سیاستِ وقت کی تازہ پیداوار ہے؟

(۶)

کیا یہ ممکن ہے کہ پیغمبرؐ اپنی محبوب ترین بیٹی کو مصائب و شدائد میں مبتلا کر دے۔

---

[1] اس روایت کی بنا پر بعض علماء نے یہ احتمال دیا ہے کہ شاید جنابِ فاطمہؑ کی قبر اسی مقام پر ہے۔ (مترجم)

صرف اس لیے کہ اسے حکم سے آگاہ نہ کرے۔ حالانکہ یہی وہ بیٹی ہے کہ جس کے غضب و مسرت پر پیغمبر اکرمؐ کے رنج و خوشی کی بنیاد ہے۔

کیا یہ پیغمبرؐ کو اچھا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی بیٹی بھرے دربار میں رسوا ہو اور ایسے مسلمانوں کے مجمع میں ذلیل کیا جائے اور اس کے بعد مسلمانوں میں ایک عظیم اختلاف پیدا ہو جائے۔ حالانکہ وہ رحمۃ للعالمین تھے۔

روایاتِ خلیفہ اور ہماری تنقید

اگر ہم ان احادیث کو جو اس موضوع میں پیش کی گئی ہیں، معنوی اعتبار سے پرکھنا چاہیں تو ہمیں انھیں دو قسموں میں منقسم کر دینا پڑے گا:

قسم اوّل: بعض احادیث میں ہے کہ ابوبکر نے کلام فاطمہؑ کو سُن کر گریہ کیا اور کہا۔ اے بنتِ رسولؐ! تمھارے باپ نے دینار و درہم کو میراث نہیں بنایا اور یہ فرمایا ہے کہ:

"انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔"

اور اس کے بعد اپنے خطبہ میں کہا کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہم گروہ انبیاء، سونا چاندی، زمین و جائداد کا وارث نہیں بناتے، ہماری میراث ایمان و حکمت علم و سنت ہے۔

قسم دوّم: عبارتِ معروف اور وہ یہ کہ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ ہم وارث نہیں بناتے جو چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔

(یا ہم جس مال کو بطورِ صدقہ چھوڑتے ہیں اس کا

وارث نہیں بناتے)[1]

سب سے اہم بات اس مقام پر یہ معلوم کرنا ہے کہ حدیث کی دلالت ، عدم وراثت پر یقینی ہے کہ قابل شک وشبہ نہ ہو ؟ یا صرف ظاہری ہے کہ اس کے دوسرے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں ؟ یا مجمل ومشتبہ ہے کہ کوئی بات واضح طور پر معلوم نہ ہوتی ہو ؟

قسم اوّل کی احادیث کا عنوان بتاتا ہے کہ اس میں دو احتمال ہیں ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقصود نفی ارث ہو جیسا کہ خلیفہ نے خیال کیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ پیغمبرؐ بتانا چاہتے ہوں کہ مقام نبوّت بہت بلند ہے ۔ اس کی شان یہ نہیں ہے کہ مالِ دنیا اور ثروتِ مادی کو جمع کرے ۔

شاید رسول اکرمؐ کا اشارہ اس بات کی طرف رہا ہو کہ انبیاء ملائکہ صفت بشر ہیں ۔ ان کے یہاں مادی انانیت ، بشری خواہشات کا گزر نہیں ۔ یہ آسمانی مخلوق ہیں ، ان کو ارضی مادہ سے کوئی علاقہ نہیں ۔ یہ منبعِ خیر ، مطلعِ نور ، مورثِ ایمان وحکمت اور اساسِ سلطنتِ الٰہیہ ہیں ۔ یہ سرمایہ دار ونفائس دنیا کے طماع نہیں ہوتے کہ درہم ودینار ، سونا چاندی زمین وجائداد مہیا کرکے اپنی میراث بنائیں ۔ اس لیے کہ میراث مال جمع کرنے کے بعد ہوگی اور یہ امور ان سے کہیں بلند ہیں ۔ ان کی نظر میں مالِ دنیا بے قیمت اور ثروتِ مادی بے وقار ہے ۔

یہ بھی ممکن ہے کہ عدم ارث کا حکم بوجہ عدم مال کیا گیا ہو ۔ جیسے کہ ہم کہیں کہ فقراء کا کوئی وارث نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے لیے آسمان سے کوئی خاص حکم اترا ہے ۔ بلکہ مقصود یہ ہوگا کہ یہ مال ہی نہیں رکھتے ۔ اسی طرح مقصودِ پیغمبرؐ یہ ہے

---

[1] اصل عبارت یہ ہے : لانورث ولا نورث ما ترکناہ صدقۃ " اب اگر ماترکناہ صدقۃ کو مستقل جملہ خیال کریں تو پہلے معنی صحیح ہوں گے اور اگر اس جز کو لانورث کا مفعول قرار دیں تو دوسرے معنی پیدا ہوں گے ۔ (مترجم)

کہ انبیاء کو مادی دولت وثروت سے رغبت نہیں ہوتی کہ وہ وارثِ مال بنائیں (ہاں اگر کوئی مال اپنی ضرورت سے بچ گیا تو اسس کا وارث ضرور بنائیں گے)

حدیث کا یہ مطلب اگرچہ ذہنِ عامہ سے بعید ہے مگر مذاقِ رسالت سے بہت قریب ہے (اس لیے کہ کلامِ رسولؐ کو ایسے گہرے معانی اور باریک مطالب پر بھی مشتمل ہونا چاہیے کہ جسے عامۃ الناس نہ معلوم کر سکیں)

اگر آپ میرے معنی سے اتفاق کرنا چاہتے ہیں تو پہلے توریث کے معنیٰ معلوم کریں کہ جس کی نفی کی گئی ہے تاکہ مطلب واضح ہوسکے۔

توریث کے معنی ہیں کسی شئے کا میراث بنانا۔

اور مورث وہ شخص ہے جو مال کے میت سے وارث کی طرف انتقال کا سبب ہو۔

یہ انتقال دو باتوں پر موقوف ہے۔

اوّل وجودِ ترکہ، دوم قانون کہ جو وارث کو مال سے حصہ دلائے۔

پہلی بات مرنے والے کی طرف سے ہوگی اور دوسری بات کا تعلق اس شریعت سے ہے کہ جس نے قانونِ میراث کو وضع کیا ہے۔ خواہ وہ کوئی ایسا انسان ہو جسے لوگوں نے حقِ قانون سازی دیا ہو یا کوئی جماعت ہو یا کوئی نبی ہو جو وحیٔ آسمانی سے احکام وضع کرتا ہے۔

اگرچہ میت اور قانون ساز دونوں ہی کو میراث میں دخل ہے لیکن مورث درحقیقت مرنے والے ہی کو کہیں گے جس نے مادۂ ارث کو جمع کرکے میراث کے شرائط مہیا کیے ہیں۔ برخلاف حاکم کے کہ اس نے قانون وضع کرکے کوئی میراث نہیں بنائی۔ بلکہ صرف ایک نظام بنا دیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی مرنے والا مال چھوڑے گا تو اس کے پسماندگان وارث ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ اس نظام سے مال موجود نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ضرورت

اس امر کی ہے کہ میت کچھ جمع کر کے چھوڑ گئی ہو۔

حاکم کی مثال بالکل اس شخص کی ہے جس نے آگ جلانے کے اسباب مہیا کر دیے ہوں۔ اب اگر آپ نے کاغذ ڈال دیا اور وہ جل گیا تو یہ فعل آپ کی طرف منسوب ہوگا۔ اس سے اس امر کا کوئی تعلق نہ ہوگا کہ جس نے آگ روشن کی ہے۔ اس لیے کہ ہر شے اپنی آخری علت کی طرف منسوب ہوتی ہے۔

اس قاعدہ کی بنا پر کسی شخص کی طرف نسبت توریث یہ بتاتی ہے کہ میراث کا براہ راست سبب یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی شخص ہوگا جس نے مال جمع کیا ہے۔ اس سے مراد وہ شخص نہیں ہو سکتا جس نے تمام اموال سے قطع نظر صرف ایک قانون بنا دیا ہے۔

اب "الانبیاء یُورِّثون" کا مفہوم یہ ہوگا کہ

انبیاء مال و دولت جمع کر کے اسے ترکہ قرار دیتے ہیں اور اس کی نفی کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی شان جمع اموال اور تحصیل ثروت سے بلند و بالا ہے وہ میراث کے لیے سعی نہیں کرتے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ عدم توریث انبیاء کا مفہوم کوئی جدید قانون نہیں ہے جو صرف ان کے لیے بنایا گیا ہو، اس لیے کہ یہ توریث مجازی ہے۔ بلکہ اس کا مطلب اموال کا جمع نہ کرنا ہے جو کہ توریث حقیقی ہے۔

لہ چونکہ وراثت دو چیزوں پر موقوف ہے ایک یہ کہ انسان میراث بنانے کے لیے مال و دولت جمع کرے اور دوسرے یہ کہ قانون کی رو سے یہ مال پسماندگان کی طرف منتقل ہو جائے۔ لہٰذا ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد کہ "ہم انبیاء وارث نہیں بناتے" پہلے مطلب کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ہماری نظر دولت دنیا پر نہیں ہوتی اور نہ ہم اسے جمع کرتے ہیں کہ اپنے ورثاء کے واسطے یہ ذخیرہ چھوڑ جائیں اور خلیفہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کی مراد دوسرے معنی ہیں یعنی ہم انبیاء کو قانونی اختیار ہی نہیں ہے کہ ہمارا مال میراث بن سکے۔ (مترجم)

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ اگر عدم توریث سے مراد توریث قانونی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جملہ آسمانی شریعتیں باطل ہیں۔ اس لیے کہ قانون کا تعلق صرف اپنے ورثا سے نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام عوام کے لیے بنایا جاتا ہے۔

اور اگر مراد عدم توریث حقیقی ہے تو صدیق کا دعویٰ باطل ہو جائے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ انبیاء مال ہی جمع نہیں کرتے، نہ یہ کہ موجودہ مال بھی صدقہ بنا کر چلے جاتے ہیں۔

پہلی روایت میں خلیفہ نے تمہیداً یہ کہا تھا: بخدا تمھارے باپ نے درہم و دینار کو میراث نہیں بنایا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ پیغمبرؐ نے کوئی مال چھوڑا ہی نہیں ہے جسے میراث بنایا جائے۔

اگر خلیفہ اس جملہ سے وہ معنی مراد لے سکتے ہیں جو ان کے موافق ہوں تو ہم بھی حدیث کا یہی مفہوم قرار دے سکتے ہیں کہ جو ہمارے موافق ہے۔

اگر ہم ان مثالوں کا بھی لحاظ کریں جو دوسری حدیث میں بیان کی گئی ہیں تو ہمارے معنی کی قیمت اور بڑھ جائے گی اس لیے کہ سونا چاندی، گھر و جائیداد کا تذکرہ خلیفہ کے معنی کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر عدم ارث کے قانون کا بیان مقصود ہوتا تو معمولی سے معمولی چیز کا ذکر کیا جاتا تاکہ معلوم ہو کہ انبیاء کسی شے کا وارث نہیں بناتے۔

مثلاً اگر ہم کہیں کہ کافر اولاد سونا چاندی کے وارث نہیں تو فوراً یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ معمولی چیزوں کے ضرور ہوں گے۔ لہٰذا اگر یہ بیان کرنا چاہیں کہ وہ کسی شے کے وارث نہیں تو کمترین اشیاء کا ذکر کریں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قانونِ عدم ارث کی توضیح موقوف ہے اس بات پر کہ ایسی اشیاء کا ذکر کیا جائے جن کو عموماً ترکہ میں حساب بھی نہیں کیا جاتا نہ کہ

نفیس اور بیش قیمت اشیار کا کہ جن سے معمولی اشیار کی میراث ثابت ہو جاتی ہے۔

ان قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کا مقصد انبیار کا زہد اور رمائل دنیا سے ان کی علیحدگی کا بیان کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لیے عمدہ اشیار کا ذکر زیادہ مناسب ہے تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ جب یہ حضرات عمدہ چیزوں کو جمع نہیں کرتے تو معمولی اشیار کو کیونکر جمع کریں گے۔

(۷)

ہمارے بیان کا شاہد اسی حدیث کا وہ جملہ بھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انبیار ایمان وحکمت کا وارث بناتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس فقرے سے مراد نئے قانون کا وضع کرنا نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ انبیار ایمان وحکمت کی اس منزل پر ہوتے ہیں جو انھیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ اپنے معارف کو نشر کر سکیں اور انھیں بطور میراث دوسروں تک پہنچا سکیں۔

اس فقرہ سے پہلے فقرہ کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ مال کو زیادہ جمع ہی نہیں کرتے کہ اس کو منتشر کریں اور اپنے بعد کے لیے اس کا کسی کو وارث بنائیں۔

(۸)

اگر یہ کہا جائے کہ کلام رسول اسلامؐ "کا فر اولاد وارث نہیں ہوتی" سے ہم ایک قانون سمجھتے ہیں تو اسی طرح اس فقرۂ حدیث کا مفہوم بھی ہونا چاہئیے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ

ان دونوں کلاموں میں ایک واضح فرق ہے اور وہ یہ کہ واضع قانون جب اپنے ماتحت افراد کے متعلق کوئی خبر دیتا ہے تو اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ خبر کے ذریعہ کوئی حکم نافذ کرنا چاہتا ہے لیکن اگر اپنے سے غیر متعلق افراد کے متعلق کوئی

خبر دے تو وہاں یہ تصور لغو ہوتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ اس کلام میں اپنی شریعت کے کافر بچوں کی خبر ہے ۔ لہٰذا یہ ایک حکم شرعی بن جائے گا ۔ لیکن اس حدیث میں انبیاء گزشتہ کی بھی خبر ہے اور ان کے لیے اب کسی قانون کے وضع کرنے کا محل باقی نہیں رہ گیا ہے ۔ جبکہ وہ دنیا سے گزر بھی چکے ہیں ۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فقروں کا مفہوم جداگانہ ہے ۔

(۹)

آپ یہ اعتراض نہیں کر سکتے کہ کیونکہ انبیاء نے مال دنیا جمع کیا ہے اس بنا پر یہ حدیث جھوٹی ہے ۔ اس لیے کہ حدیث میں توریث کی نفی کی گئی ہے ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ میراث کی نسبت انبیاء کی طرف نہیں ہے کہ انھوں نے مال تلاش کر کر کے جمع کیا ہو تا کہ کسی کو اپنا وارث بنالیں ۔

انبیاء کرامؑ اگرچہ دارِ دنیا میں سیم و زر کے مالک تھے لیکن نہ اس لیے کہ انھوں نے اس کے پیچھے گردش کی ہو ، جیسا کہ عامۃ الناس کا طریقہ ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کلام کو رسولؐ نے کنایۃً فرمایا ہو جس سے مقصود اس کے لفظی معنی اصلاً نہ ہوں بلکہ مراد زہد انبیاء ہو ۔ اس صورت میں مالِ دنیا کا ان کے پاس جمع ہونا حدیث کی صحت کے لیے قطعاً مضر نہیں ہے ۔

جیسا کہ زمانۂ قدیم میں کریم انسان کو زیادہ خاکستر والا کہا کرتے تھے اور یہ کلام صحیح تھا ۔ اگر وہ کریم ہو خواہ اس کے گھر میں راکھ نہ بھی ہو ۔ اس لیے کہ مراد معنیٔ لفظی نہ تھے بلکہ یہ ایک کنایہ تھا ۔

اسی طرح اس حدیث میں مراد بیان زہد انبیاء ہے خواہ ان کے پاس مالِ دنیا ہو یا نہ ہو ۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ انبیاء کے اموال کی دو توجیہیں ہو سکتی ہیں ۔ یا تو یہ

کہا جائے گا کہ یہ مال اس طرح نہیں جمع کیا گیا جس طرح لوگ اپنی اولاد کی خاطر جمع کرتے ہیں۔ یا یہ کہا جائے گا کہ روایت میں برات کی نفی سے مراد صرف انبیاء کے زہد و تقوے کا بیان کرنا ہے، خواہ ان کے پاس ساری کائنات کی دولت موجود ہو۔

(۱۰)

اگر ہم حدیث کی قسم دوم کا مطلب معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں حسب ذیل تین معانی میں فرق کرنا چاہیے:

(۱) ترکۂ میت میراث نہیں بنتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شے جو وقت وفات تک مرنے والے کی ملکیت تھی اور جسے وہ چھوڑ کر گیا ہے میراث نہیں ہے۔ یہ معنی اس وقت ہوں گے جب "ما ترکناہ صدقۃ" کو الگ جملہ فرض کریں گے۔

(۲) ہر وہ شے جسے میت نے اپنی حیات میں صدقہ کر دیا ہے یا وقف کر دیا ہے وہ میراث نہیں بن سکتی بلکہ صدقہ و وقف ہی رہے گی اور ورثاء "غیر مصدقہ" اموال کے وارث ہوں گے۔ یہ معنی اس وقت ہوں گے جب "ما ترکناہ صدقۃ" کو تتمۂ کلام قرار دیں گے۔

(۳) فلاں شخص کے پاس اپنا ترکہ نہیں ہے کہ میراث بنے، بلکہ اس کے جملہ متروکہ اموال، صدقات و اوقاف کے ہیں۔ یہ معنی اس وقت ہوں گے جب "ما ترکناہ صدقۃ" کو ایک علیحدہ خبر فرض کریں گے جس کو قانون سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

جب ہمیں ان عبارات کا فرق معلوم ہو گیا تو یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ الفاظِ حدیث کا مطلب نہایت ہی مجمل و مشتبہ ہے جو تینوں معانی پر منطبق ہو سکتا ہے۔

اس لیے کہ حدیث کا دوسرا فقرہ "ما ترکناہ صدقۃ" اگر مستقل طور پر مبتدا اور خبر قرار دیا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ:

"ملکِ میّت میراث نہیں بلکہ صدقہ بن جائے گی۔"

اور یا یہ ہوگا کہ:

"میّت کسی شے کی مالک نہیں ہے بلکہ اس کا جملہ ترکہ صدقہ ہے جو اس نے جمع کر رکھا ہے۔"

اور اگر اس فقرہ کو پہلے فقرہ کا تتمہ قرار دیا جائے تو اس سے مراد دوسرے معنی ہوں گے، یعنی یہ کہ:

"وہ مال جسے میّت نے اپنی زندگی میں تصدق کر دیا ہے وہ میراث نہیں ہے۔ باقی اموال میراث بن سکتے ہیں۔"

اس صورت میں ما ترکناہ مفعول ہوگا، مبتدا نہ ہوگا بلکہ اس فقرہ کو پلٹ کر کہا جائے ما ترکناہ صدقۃ لا نورث تو اس کا مفہوم بھی یہی ہوگا جو بیان کیا گیا ہے۔

تو جس طرح عکس کلام کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ میراث نہیں بنتا اسی طرح اصل کلام کا مطلب بھی یہی ہوگا۔ یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ (میراث صدقہ بن جاتی ہے) لہٰذا اب یہ حدیث صدقہ کے میراث ہونے کی نفی کرے گی نہ کہ انبیاء کے لیے نئے قانون کی بنیاد ہو گی۔

اب ہم علم نحو سے دلچسپی رکھنے والے افراد کا لحاظ کرتے ہوئے اعراب بھی کیے دیتے ہیں۔ پہلی صورت میں صدقہ پر "پیش" ہوگا۔ اس لیے کہ خبر ہے۔ اور دوسری

صورت میں اس پر "زبر" ہوگا۔ چونکہ تمییز ہے اور یہ فرق ہمارے مطلب کے لیے مضر نہیں ہے اس لیے کہ وقتِ تکلم اکثر اعراب ظاہر نہیں ہوتا۔ بالخصوص کلمات کے آخر میں۔

(۱۱)

جب ہم نے معنیٔ روایت کے مختلف احتمالات آپ کے سامنے پیش کر دیے تو اب اگر ہم اس امر کا دعویٰ کریں کہ روایت صراحتاً خلیفہ کے مقصد پر دلالت نہیں کرتی تو ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ بلکہ میرا دعویٰ یہ تو ہے کہ میرے معنی (صدقہ میراث نہیں بنتا) خلیفہ کے معنی (میراث صدقہ بن جاتی ہے) سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔

اس لیے کہ حدیث میں ضمیر جمع ہے اور جمع کا استعمال فردِ واحد میں مجاز ہے جو اگرچہ مقامِ تعظیم میں استعمال ہوتا ہے لیکن یہ بات شانِ انکسارِ پیغمبر اسلامؐ سے بہت زیادہ بعید ہے۔ بنا بریں ظاہرِ لفظ کا تقاضا یہ ہے کہ لفظ کو جماعت کے لیے استعمال کیا جائے اور تنہا پیغمبرؐ کے لیے مخصوص نہ کیا جائے اور اصولِ تکلم یہ بتاتے ہیں کہ اس جماعت سے مراد جماعتِ مسلمین ہے نہ کہ جماعتِ انبیاء۔ اس لیے کہ یہ حدیث ذکرِ انبیاء سے خالی ہے اور اس سے قبل بھی ان کا کچھ ذکر نہ تھا۔

اب اگر آپ یہ احتمال دیں کہ شاید وقتِ تکلم رسول اکرمؐ کوئی قرینہ رہا ہو جو اس امر پر دلالت کر رہا ہو کہ مراد جماعتِ انبیاء ہے کہ روایت کو مع جملہ قرائن کے بیان کرے۔ اور جب انھوں نے بیان نہیں کیا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کا کوئی قرینہ وقتِ تکلم بھی نہ تھا۔

مزید برآں یہ کہ ایسے قرینہ کا حذف کر دینا مطلوبِ خلیفہ کے خلاف بھی تھا لہٰذا اگر کوئی ایسی شے ہوتی تو وہ ضرور بیان کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بعینہٖ انھیں حدود کے ساتھ بلا زیادتی وکمی صادر ہوئی تھی۔

ہیں نے جماعتِ مسلمین کو اس لیے مقصود قرار دیا ہے کہ یہ رسمِ دنیا ہے کہ جب کوئی شخص مجمع میں گفتگو کرتا ہے اور جمع کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو اس سے مراد وہی جماعت ہوتی ہے جو نگاہوں کے سامنے موجود ہو۔

مثلاً کوئی عالم ایک اجتماعِ احباب میں بیٹھ کر کوئی بات کہے اور وہ جماعت سے متعلق ہو تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہی احباب کی جماعت ہوگی جو نگاہوں کے سامنے موجود ہو نہ کہ علماء کی جماعت۔ بلکہ اگر اس کے مقصود علماء ہوں اور بیان نہ کرے تو یہ معمہ ہو کر رہ جائے گا۔

جب یہ واضح ہے کہ حدیث سے مراد جملہ مسلمان ہیں تو اب کیا اس حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ مسلمان میت کا کوئی وارث نہیں ہوتا؟ یا یہ کہ مسلمان جو کچھ چھوڑ کر مرے سب صدقہ ہے، ترکہ نہیں؟

حاشا وکلا! یہ تو ضروریاتِ دینِ اسلام کے خلاف ہے اس لیے کہ مسلمان، بنصِ قرآن مختلف اسباب سے اموال کا مالک ہوتا ہے اور بعدِ مرگ اس کے ورثا اس کے مال کے وارث ہوتے ہیں۔

ہاں! اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ صدقہ میراث میں داخل نہیں تو اس میں کوئی خرابی نہیں۔ یہ ایک عام اسلامی اصول ہے جو جملہ صدقاتِ مسلمین میں رائج ہے۔ یہ بھی کوئی عجیب بات نہیں کہ صدقہ کے میراث نہ ہونے کا حکم جو کہ اس قدر واضح ہے یہ صدرِ اسلام میں اس قدر واضح نہ تھا کہ محتاجِ بیان نہ ہو۔ اس وقت یہ احتمال بہت قوی تھا کہ صدقات و اوقاف بعدِ مرگ ختم ہو جائیں اور اموال میراث بن جائیں۔

میرے اس معنی کی رد اس بات سے نہیں ہو سکتی کہ اسے فاطمہ زہرؑا نے خلیفہ کے سامنے بیان نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس کی چند وجوہ ہیں:

(۱) ——— وہ سخت موقع جس میں فاطمہ زہرؑا نے قیام کیا تھا اس میں اتنی

گنجائش نہ تھی کہ ایسے دقیق اعتراضات کیے جائیں۔ اس لیے کہ حکومتِ وقت کا مطلب یہ تھا کہ جلد سے جلد صورتِ حال پر قابو حاصل کرلے یہی وجہ ہے کہ جب شہزادیؑ نے آیاتِ قرآنیہ کو استدلال میں پیش کیا تو خلیفہ نے سوائے ہاں ہاں کے کوئی جواب نہ دیا (ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد) ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں ان اعتراضات کا جواب صرف یہ ہوتا کہ ہم نہیں مانتے، لہٰذا ان کا بیان کرنا لغو تھا۔

(۲) ان اعتراضات کو فاطمہ زہراؑ کے مقصد سے کوئی لگاؤ بھی نہ تھا اس لیے کہ ان کا مقصد حکومتِ وقت کا ابطال تھا اور اس کے لیے ایسے طریقے اختیار کرنے ضروری تھے کہ جو عام فہم ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے خطبہ میں لوگوں کی عقلوں کو مخاطب کیا لیکن جو باتیں پیش کیں وہ بدیہیات اور واضحات میں سے تھیں۔ تاکہ لوگ ایسی خلافت سے نفرت کریں جو ایسے بے بنیاد اصول پر مبنی ہو۔ چنانچہ پہلے فاطمہ زہراؑ نے یہ واضح کیا کہ خلیفہ کے فیصلے کی کوئی قرآنی سند نہیں ہے (اس لیے کہ قرآن میں توارثِ مسلمین کی آیات موجود ہیں)[1]

اور اس کے بعد وہ آیات پیش کیں جن میں توارثِ سلیمان کا ذکر ہے اور پھر ان آیات کا ذکر کیا جن میں میراثِ انبیاء کا ذکر ہے اس کے بعد رنگِ استدلال کو یوں بدل دیا

---

[1] آج کل یہ بات واضحات میں سے ہو چکی ہے کہ خبرِ واحد معتبر عموماتِ قرآن کو تخصیص دے سکتی ہے۔ اس لیے کہ ایسی خبر اصالۃ العموم یا اصالۃ الاطلاق پر حاکم یا وارد ہوا کرتی ہے۔ کما ھو الصحیح۔ لیکن اس کے باوجود فاطمہ زہراؑ کا عمومات سے استدلال کرنا یہ بتاتا ہے کہ آپ ابوبکر کو معتبر نہ سمجھتی تھیں۔

کہ اگر حکمِ خلیفہ حق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نبیؐ و وصیؑ سے زیادہ عالم ہے اس لیے کہ انھوں نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ ترکۂ نبیؐ کا علم ابوبکر کو نبیؐ و علیؑ سے زیادہ کسی صورت سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔

"یا ابن ابی قحافہ! تو اپنے باپ کا وارث ہے اور میں اپنے باپ کی وارث نہیں؟ یہ تو بہت بڑا بہتان ہے! کیا تو نے عمداً کتابِ خدا کو پس پشت ڈال دیا ہے؟ وہ تو کہتا ہے کہ سلیمانؑ وارثِ داوٗدؑ بنے۔ اس میں تو ہے کہ زکریاؑ نے یحییٰؑ کی وراثت کی دعا کی۔ اور اس کا قانون ہے کہ صاحبانِ قرابت وارث ہوتے ہیں۔ کیا تیرے لیے کوئی خاص آیت ہے جس سے میرے باپ کو الگ رکھا گیا ہے؟ کیا تیرا خیال ہے کہ مختلف المذہب آپس میں وارث نہیں ہوتے تو کیا میرا اور میرے باپ کا مذہب ایک نہیں ہے؟ کیا تو عموم و خصوصِ قرآن کو میرے باپ اور ابن عم سے بہتر سمجھ لیتا ہے؟"

فاطمہؑ کے اقدام میں سب سے زیادہ نمایاں پہلو جذباتی تھا اور عجیب نہیں کہ فاطمہؑ نے ساری کوشش اسی بات پر صرف کر دی ہو کہ لوگوں کے قلوب و جذبات کو اپنی طرف موڑ لیں۔ اس لیے کہ قلب ہی حاکمِ نفس اور تمہیدِ روحِ انقلاب ہے۔

فاطمہؑ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں اور انھوں نے اپنے بیان کو ایسا رنگ دے دیا کہ احساسات بیدار ہو گئے، جذبات تڑپ اٹھے، دل بے قابو ہو گئے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک عورت کے لیے اس سے بہتر اسلحہ اور کیا ہو سکتا ہے اگر وہ ایسے وقت میں قیام کرنا چاہے جس میں فاطمہؑ نے کیا۔

اگر فاطمہؑ کے بیان کا علمی جمال دیکھنا چاہیں تو ہمیں اس خطبہ کی طرف متوجہ

ہونا پڑے گا جو شہزادیؑ نے مجمع انصار میں فرمایا تھا۔
فرماتی ہیں :

" اے گروہ باقی ماندہ مسلمین ! اے انصارِ ملت !
اے مربیانِ اسلام ! آخر یہ میری نصرت میں کوتاہی اور میری مدد میں سستی کیوں ہے ؟ تم نے میرے حق پر چشم پوشی کیوں کی ؟ اور تم میرے ظلم پر سو کیوں گئے ؟
کیا رسولؐ نے نہیں فرمایا تھا کہ انسان کا تحفظ اس کی اولاد سے ہوتا ہے ۔ بہت جلدی تم نے باتیں بدل دیں اور نئی نئی باتیں ایجاد کریں ، ابھی رسولؐ کا انتقال ہوا ہے اور تم نے دین کو بھی زندہ درگور کر دیا ۔ حق یہ ہے کہ انتقالِ رسولؐ ایک حادثۂ عظیم ہے جس سے دین اور ضعیف ہو گیا ۔ اس میں پڑنے والے شگاف مبہم ہو گئے ، کوئی انھیں پر کرنے والا بھی نہیں ۔ زمین تاریک ہے ، پہاڑ مضطرب ہیں اور امیدیں پامال ہو گئیں ۔ حریمِ رسالت کو ضائع اور برباد کیا گیا ، ان کی ہتکِ حرمت کی گئی ۔ یہی مصیبت ہے جس کا قرآن نے اعلان کیا کہ " اگر پیغمبر مر جائے یا قتل ہو جائے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دین سے پھر جاؤ اور جو دین سے پلٹ گیا اس سے اللہ کا نقصان نہیں ہے ۔"
" کیوں اے بنی قیلہ ! تمھارے سامنے میری میراث ہڑپ کر لی گئی ۔ تم تک خبر نہ پہنچی ، تم نے آواز سنی تمھارے پاس آدمی بھی تھے اور اسلحے بھی ۔ تمھیں اللہ نے منتخب کیا تھا تمھیں اس نے چنا تھا لیکن اس کے باوجود تم نے سانس

بھی نہ لی۔"

ان بیانات سے ثابت ہوگیا کہ معنیٰ حدیث میں مناقشہ کرنا حکومتِ وقت کو بے اثر نہیں بنا سکتا تھا۔ اور اس کو اس مقصد سے کوئی علاقہ نہ تھا جسے فاطمہؑ لے کر اٹھی تھیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ آپ نے عطیہ کا بھی تذکرہ اس خطبہ میں نہیں فرمایا۔

خلیفہ کا مقصد کیا ہے؟

جب ہم خلیفہ کی روایات کی وضاحت کر چکے اور یہ ثابت کر چکے کہ ان روایات کی دلالت ان کے مقصد پر واضح نہیں ہے تو اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت زہراؑ کے مقابلہ میں ابوبکر کے موقف کی توضیح کرتے ہوئے مسئلہ فدک میں ان کی صحیح رائے معلوم کریں۔ اگرچہ ایک تحقیق کرنے والے کے لیے یہ موقع انتہائی دشوار گزار ہے۔ اس لیے کہ باوجود تاریخی بیانات کی کثرت کے مسئلہ ایک محیر العقول حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس مسئلہ میں کوئی مرکزِ نزاع معین ہوتا نظر نہیں آتا۔

لوگوں کا خیال ہے کہ مرکزِ نزاع مسئلہ وراثتِ انبیاء ہے۔ اس سلسلہ میں صدیقہ مدعی ہیں اور ابوبکر منکر، لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ اس نقطہ پر مسئلہ پوری طرح حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ اور اس طرح پر حسب ذیل امور کا کوئی معقول رشتہ دکھائی نہیں دیتا:

(۱) —— دورانِ گفتگو میں خلیفہ نے صدیقۂ طاہرہؑ سے کہا: "یہ مال پیغمبرؐ کا نہیں تھا، بلکہ مسلمانوں کا مال تھا جس کو پیغمبرؐ بحیثیت امیر صرف کیا کرتے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوگیا تو اب اس کا اختیار میرے ہاتھ میں ہے۔" اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ محل بحث علاوہ وراثتِ انبیاء کے کوئی اور شے ہے۔

(۲) ———— دوسری گفتگو کے دوران میں خلیفہ نے کہا : " اے فاطمہؑ تمھارے باپؐ مجھ سے اور تم میری اولاد سے بہتر ہو لیکن رسولؐ نے فرمایا ہے کہ ہم اپنے ترکہ کا وارث نہیں بناتے یعنی ان مطلوبہ اموال کا "

اس کلام میں آخری جملہ قابلِ توجہ ہے۔ اس لیے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف پیغمبر اکرمؐ کی میراث کے لیے ہے نہ کہ جملہ انبیاء کی۔ اور نہ اس کا کوئی تعلق مسلمانوں سے ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ خلیفہ کی نظر میں حدیث کا مطلب یہ نہیں تھا کہ (صدقہ میراث نہیں بنتا) اس لیے کہ یہ قانون تمام مسلمانوں کے لیے ہے اور نہ حدیث کا مطلب یہ تھا کہ رسول اکرمؐ کے اموال صدقہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کا تعلق تمام اموال سے ہے نہ کہ صرف فاطمہؑ کے مطلوبہ اموال سے۔ حالانکہ ظاہرِ حدیث یہ ہے کہ یہ روایت صرف اموالِ فاطمہ زہراؑ کے بارے میں پیش کی گئی ہے لہٰذا اب اگر عدم توریثِ انبیاء کوئی قانونی بات ہے تو اسے جملہ اموالِ متروکہ میں جاری ہونا چاہیے، صرف اموالِ فاطمہؑ سے اس کا تعلق خلافِ انصاف ہے۔

اس کی مثال یوں ہی ہے کہ اگر کوئی شخص حکم دے کہ آج رات تمام آنے والوں کا احترام کرو۔ اور اتفاقاً اس رات میں دو آدمی آجائیں تو ظاہر ہے کہ متکلم کی مراد صرف یہ دو آدمی نہیں تھے بلکہ ایک قاعدہ تھا جو ان دو پر منطبق ہوگیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ

ترکۂ نبیؐ کی تفسیر ان اموالِ خاصہ سے بتاتی ہے کہ خلیفہ کے نزدیک یہ حکم انھیں اموال سے مخصوص ہے۔ حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ

قانون صرف چند چیزوں سے مخصوص نہیں ہوتا بلکہ جملہ افراد پر حاوی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ

اس آخری جملہ کا فائدہ کیا ہے اور خلیفہ کا اس سے مقصود کیا ہے؟ اگر حکم عدم وراثت عام ہے تو کیا خلیفہ کو ان اموال پر ترکہ کے صدق میں کوئی شک تھا؟

اگر یہ مان لیا جائے تو اس میں خلیفہ کا فائدہ تو ضرور ہے۔ اس لیے کہ جب ترکہ ہونے میں شک ہوگا تو ورثہ کی طرف منتقل بھی نہ ہوگا۔ لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ اس جملہ سے خلیفہ اپنا شک رفع کرنا چاہتے ہیں اور فاطمہ زہراؑ کو باقی اعتراضات سے روکنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ فاطمہؑ کا مطالبہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مال کو ترکہ میں داخل سمجھتی ہیں، ورنہ پھر میراث کیوں بنتا؟

ہاں ہم یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ اموال فاطمہؑ بھی ترکہ کا ایک جزو ہیں اور مراد پیغمبرؐ تمام ترکہ نہیں ہے بلکہ شاید ان کا مقصود فدک جیسی جائیداد ہو تو کیا ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ خلیفہ کی غرض اس جملہ سے، حکم کا فاطمہؑ کے اموال سے مخصوص کرنا ہے۔

یہ تو غیر ممکن ہے۔ اس لیے کہ اموال پیغمبرؐ بعض میراث ہوں اور بعض نہ ہوں، یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس آخری ٹکڑے سے اگر خلیفہ کا مطلب یہ تھا کہ فاطمہؑ کو بتا دیں کہ تمھارے باپؐ نے مطلوبہ اموال کو ترکہ قرار دیا ہے تو یہ لغو ہے۔ اس لیے کہ وہ تو ترکہ ہی سمجھ کر میراث میں مطالبہ کر رہی ہیں۔ اور اگر یہ بتانا ہے کہ تمھارے باپؐ نے بڑے بڑے اموال کو صدقہ قرار دیا ہے تو یہ خود بڑی عجیب سی بات ہے کہ پیغمبرؐ کا کچھ مال تو میراث بن جائے اور کچھ نہ بن سکے۔ جب کہ دیگر روایتیں

عام حکم کا اظہار کرتی ہیں۔

ان تاویلات سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ خلیفہ کی نظر میں مفہوم حدیث یہ تھا کہ ہم ان اموال کے مالک ہی نہیں ہیں کہ ان کا کوئی وارث ہو اور اسی لیے آپ نے اسے متروکہ فرمایا ہے۔ جیسے کہ کوئی شخص اپنی اولاد کو جمع کر کے کہے کہ میرا تمام متروکہ صدقہ ہے تو اس کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ میری ملکیت نہیں کہ یہ لوگ میرے بعد اس کے وارث ہوں۔

(۳) ـــــــ فاطمہؑ کے نمائندہ کو ابوبکر کا جواب جب اس نے آکر فدک اور خمس خیبر وغیرہ کا مطالبہ کیا تو انھوں نے حدیث سنائی۔ "ہمارے مال کا کوئی وارث نہیں"۔ صرف آل محمدؐ اس میں کھا سکتے ہیں، میں صدقات رسولؐ میں ذرہ برابر تغیر نہیں دے سکتا۔

اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ خلیفہ کی رائے میں حدیث (کا مفہوم یہ ہے کہ انبیاء کے املاک میراث نہیں بنتے) تو بھی ان کے کلام میں تناقض پیدا ہو جائے گا اس لیے کہ اس حدیث سے استدلال یہ بتاتا ہے کہ وہ مطالبات زہرؑا کو اموال نبیؐ میں جانتے ہیں، لیکن اس کی میراث کے قائل نہیں ہیں اور جملۂ آخر اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس لیے کہ جس مال میں فاطمہ زہرؑا ردش پیغمبر کو (بقول ابوبکر) بدلنا چاہتی تھیں وہ فدک وخمس خیبر وغیرہ ہے۔ جن کو انھوں نے پہلے اموال میں شمار کیا ہے اور اب صدقات نبیؐ سے تعبیر کر رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اموال نہیں ہیں بلکہ صدقات ہیں۔

اور یہ ایک متضاد منطق ہے۔

خلیفہ سے تصفیہ کا حساب

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر کسی بھی نبی کی وراثت کے قائل نہ تھے۔ اس لیے کہ جس روایت نے خطبۂ زہراؑ کو نقل کیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ ابوبکر نے "انا معاشر الانبیاء" سے استدلال کیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ فاطمہؑ نے میراث کی عام و خاص تمام آیات سے اعتراض کیا لیکن ابوبکر عدم توریث نبی پر اڑے رہے اور روایت کو بزور بیان کرتے رہے۔ فاطمہؑ بھی اسی شدت سے انکار کرتی رہیں۔

اب خلیفہ کی دو حدیثیں ہو گئیں:

(۱) ——— صدقات میراث نہیں بنتے۔
(۲) ——— انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔

اور اس سے ان کے دو دعوے بنے:

(۱) ——— فدک صدقہ ہے لہٰذا میراث نہیں بن سکتا۔
(۲) ——— املاکِ نبی میراث نہیں بنتے۔

پہلی حدیث میں آخری جملہ کا اضافہ کر کے فدک کو صدقہ بنایا اور دوسری حدیث سے اس کا میراث ہونا ختم کر دیا۔

ان بیانات کے بعد اگر ہم خلیفہ سے تصفیہ کا حساب کرنا چاہیں تو اس میں ذرا بھی دقت نہ ہو گی۔ اس لیے کہ موقف بالکل واضح ہو گیا ہے اور حدیث کے سارے احتمالات سامنے آ چکے ہیں۔

ہمارے اب تک کے اعتراضات کا خلاصہ حسب ذیل امور میں واضح ہو جاتا ہے:

(۱) ——— خلیفہ نے اکثر اوقات میں خود اپنی حدیث کی مخالفت کی جیسا کہ ابتدائے بحث میں بیان کیا گیا۔

(۲) ——— یہ احتمال بے جا ہے کہ رسولؐ نے اپنی دخترؑ سے حدیث کو مخفی رکھا اور اسے ابوبکر سے بیان کر دیا[1]۔ حالانکہ ابوبکر عادتاً رسولؐ کے ساتھ تنہا نہ رہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رسولؐ نے عمداً تنہائی میں بلا کر انھیں حدیث بتا دی اور فاطمہؑ سے چھپا لیا تاکہ بھرے دربار میں یہ خجل و شرمندہ ہوں (نعوذ باللہ)

(۳) ——— علیؑ بلاشک و ریب، وصیٔ رسول اکرمؐ ہیں جیسا کہ حدیث متواتر میں وارد ہوا ہے کہ جو کتب روایت سے گزر کر شعراء کے دواوین تک پہنچ گئی اور جس کو حسب ذیل حضرات نے نظم بھی کر دیا:
عبداللہ ابن عباس، خزیمہ بن ثابت، حجر بن عدی، ابی ہیثم بن تیہان، عبداللہ بن ابوسفیان بن حرث بن عبدالمطلب، حسان بن ثابت، امیرالمومنین علی ابن ابیطالب[2]۔ بنابریں وصایت وہ منصب اسلامی ہے کہ جو علیؑ کی ذات کے ساتھ بلاشک و شبہ مخصوص ہے[3]۔ اگرچہ اس وصایت میں شیعہ و سنی میں اختلاف ہے۔ شیعہ کا خیال ہے کہ وصایت بمعنی نص رسولؐ ہے اور سنی

---

[1] یہاں تک کہ عائشہ بیان کرتی ہیں کہ جب بعد وفات رسول کریمؐ میراث میں اختلاف ہوا تو کسی کے پاس کوئی علم نہ تھا۔ آخر کار اباجان نے یہ روایت بیان کر دی کہ انبیاء لاوارث ہوتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صواعق محرقہ۔ ابن حجر عسقلانی)

[2] شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۴۷-۴۹ ج ۳ ص ۱۵

[3] شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۴۶

کا خیال ہے کہ وصایت بمعنی وراثتِ علم و شریعت وغیرہ ہے)

میں اس وقت اس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتا۔ صرف جس قدر میرے موضوع سے متعلق ہے اسی قدر بیان کرنا چاہتا ہوں اور اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ وصایت بمعنی خلافت ہے تو پھر کہنا پڑے گا کہ صدیق نے اسلامی اقدار میں بہترین اشیاء کی چوری کی اور امورِ امت میں بلا وجہ شرعی تصرف کیا اور ایسے شخص کو حکومت کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی حدیث معتبر ہے۔

اور اگر یہ مان لیں کہ وصایت بمعنی وراثتِ علم و شریعت ہے تو کیا ممکن ہے کہ اس وصایت کو مانتے ہوئے اس حدیث کو بھی مان لیں جس کا وصی انکار کرے۔ حالانکہ شریعتِ سماویہ کے لیے سیدا رمغز یہی ایک انسان ہے جس کی رائے ہر ایک مسئلہ میں بلا تردد قبول کرنی چاہیے۔ یہ ابنِ رسولؐ اور اعلمِ شریعتِ پیغمبرؐ ہے۔

اگر یہ احتمال دیں کہ وصایت سے مراد وراثتِ مخصوصاتِ رسالت ہے تو پھر اس کا کیا مطلب ہے کہ وارثِ رسولؐ کے ہوتے ہوئے ترکہ رسولؐ کو غیروں کے ہاتھوں میں چھین

(۴) ———— ترکۂ نبوت پر بلا وجہ شرعی کے قابض ہو جانا یہ خلیفہ کے اولیات[1] میں سے ہے۔ اس سے قبل تاریخ میں اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ حالانکہ اگر یہ قاعدہ وراثتِ انبیاء کے متعلق ہوتا تو ہر خلیفہ کا کردار اس کے نبیؐ کے متروکات کے متعلق ایسا ہی ہوتا جس طرح کہ یہاں تھا۔

ملکیت فدک سے انکار کر دینا جیسا کہ بعض کلمات سے ظاہر ہوتا ہے۔ انتہائی جلد بازی کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک

---

[1] اولیات تاریخ میں ان تمام باتوں کو کہتے ہیں کہ جن کو صاحب معاملہ سے پہلے کسی اور نے نہ ایجاد کیا ہو۔ مترجم

تاریخی حقیقت ہے کہ فدک بلا کسی حرب وضرب کے حاصل ہوا ہے اور ہر وہ خطہ جو بغیر جنگ کے حاصل ہو خاص پیغمبر کی ملکیت ہوتا ہے۔ جیسا کہ آیاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے[1] پھر اس قسم کی کوئی بھی حدیث نہیں ہے کہ پیغمبرؐ نے اسے تصدق یا وقف کر دیا ہو۔

(۵) ——— دہ دونوں حدیثیں جو خلیفہ نے اس موضوع میں پیش کی ہیں قطعاً ان کے مطلوب کے لیے وافی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے معانی کچھ اور ہیں جن کی وضاحت کی گئی۔ اگر کوئی شخص ہمارے معنی کو معین طور پر تسلیم نہ کرے تو کم از کم اتنا تو ضرور مانے گا کہ تمام معانی برابر ہیں اور اس صورت میں کلام مجمل ہو جاتا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ مجمل کلام سے استدلال انتہائی مہمل ہوتا ہے۔

ان اعتراضات کے بعد ہم ایک اعتراض اور کر سکتے ہیں۔ اس فرض پر جب ہم خلیفہ کے بیان کردہ معانی کو تسلیم کر لیں اور کہیں کہ "انا معشر الانبیاء لا نورث" سے مراد قانون عدم وراثت ہے اور "ما ترکنا ہ صدقۃ" سے مراد مستقل جملہ ہے کہ ہمارے متروکات صدقہ بن جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہیں گے کہ اس روایت کی تاویل انتہائی ضروری ہے اور اس کے ظاہر پر اعتماد اصطلاح علمی کے لحاظ سے ناجائز ہے اور وہ اس لیے کہ روایت کا مطلب جمیع انبیاء کا لاوارث ہونا ہوگا۔ جیسا کہ بعض احادیث میں صراحتاً بیان ہوا ہے اور "لا نورث" میں صیغۂ جمع بھی اسی بات پر دال ہے۔ اس لیے کہ حکم جماعت کے لیے ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی کوئی جماعت عامۃ المسلمین میں نہیں ہے کہ جس کی خصوصیات میں عدم توریث بھی

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۲۳۹ تاریخ کامل ج ۲ صفحہ ۸۵ شرح نہج البلاغہ ج ۴ صفحہ ۷۸

داخل ہو۔ حالانکہ عدم توریث جمیع انبیاء صریح قرآن کے مخالف ہے۔ جس میں مختلف انبیاء مثل زکریاؑ و سلیمانؑ وغیرہ کی وراثت کا تذکرہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس وراثت سے بھی مراد وراثتِ مال ہے (اس لیے کہ وہی اس قابل ہے کہ ورثہ کی طرف منتقل ہو سکے) علم و شریعت حقیقتاً قابل انتقال نہیں ہیں[1]۔ (اس لیے کہ علم بنا بر قول بہ اتحاد عاقل و معقول غیر ممکن الانتقال ہے بلاشک و ریب)

اور اسی طرح اگر ہم عاقل و معقول میں وجود کے اعتبار سے مغائرت بھی تسلیم کریں جب بھی اتنا ضرور کہیں گے کہ صور علمیہ مجرد ہوتی ہے اور وہ نفس انسانی کے ساتھ قائم ہیں یعنی معلول نفس ہیں اور ظاہر ہے کہ ہر معلول بحیثیتِ ذات اپنی علت سے وابستہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا ایک علت کو چھوڑ کر دوسری کی طرف منتقل ہو جانا نہایت ہی غیر معقول ہے۔

اور اگر ہم اس امر کے قائل ہو جائیں کہ صورت علمیہ معلول نفس نہیں ہے بلکہ نفس انسانی میں حلول کیے ہوئے ہے اور اس کی علت کوئی اور شے ہے، جب بھی یہ واضح امر ہے کہ ایک حلول کرنے والی شے کبھی اپنا محل تبدیل نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ فلسفہ میں ثابت ہو چکا ہے۔ اس صورت میں خواہ ہم صورتِ علمیہ کو مجرد مانیں یا مادی کوئی فرق نہ ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحقیق فلسفی کے اعتبار سے علم کسی صورت سے قابل نقل و انتقال نہیں ہے۔

اسی طرح نبوت بھی عقلی اعتبار سے قابل نقل و انتقال نہیں ہے خواہ ہم نبوت کی وہ تفسیر کریں کہ جو بعض فلاسفہ نے کی ہے۔ یعنی نبوت کمالِ نفس کا ایک رتبہ اور فضلِ انسانی کا ایک آخری درجہ ہے جہاں ارتقائے انسانیت اور کمالِ بشریت کی حد بندی ہو جاتی ہے یا وہ معنی بیان کریں جو اذہانِ عامہ مسلمین میں ہیں۔ یعنی

---

[1] یہ قوسین کے درمیان کی عبارت اگر ترک بھی کر دی جائے تو مطالعہ میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا۔ (مترجم)

یہ کہ نبوت ایک منصب الٰہی ہے جس کو وہ "جعل" کرتا ہے کمالِ نفس صرف شرائطِ نبوت میں ہے وہ عینِ نبوت نہیں ہے۔

واضح ہے کہ پہلے معنی کے اعتبار سے نبوت قابلِ نقل وانتقال نہیں ہے۔ اس لیے کہ نبوت نفسِ وجودِ نبیؑ اور عینِ کمالِ ذاتی پیغمبرؐ ہے۔ اسی طرح دوسرے معنی کے لحاظ سے، اس لیے کہ اس بنا پر نبوت ایک ربانی اعتبار ہے جو کسی خاص شخص سے قائم ہوتا ہے۔ اس کا انتقال بغیر تبدیلِ شخص کے ناممکن ہے اور تبدیلِ شخص ایک نئے اعتبار کو مستلزم ہے جس سے کہ نئی نبوت بن جائے گی۔ مثلاً نبوت زکریاؑ۔ یہ مختصات نفسِ زکریاؑ میں سے ہے۔ وہ کسی اور طرف منتقل ہو جائے یہ ناممکن ہے۔ اگر اللہ کسی اور کو بھی نبی فرض کرے گا تو یہ جدید نبوت ہو گی نہ کہ منتقل نبوت۔

یہ امر تو بادی النظر میں بھی واضح ہو جاتا ہے کہ نبوت اور علم قابلِ انتقال نہیں ہیں۔ یہ کوئی ایسی عمیق و دقیق بات نہیں ہے کہ خلیفہ کی سمجھ میں نہ آسکے اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ چیزیں قابلِ توارث وانتقال نہیں ہیں تو مراد صرف وراثت مال ہے۔ اور اس حالت میں آیت، روایتِ خلیفہ سے معارض ہو جائے گی لہٰذا کم از کم روایت کی تاویل تو کرنا ہی پڑے گی۔

✻ ——— جناب زکریاؑ کے قصہ میں وراثتِ مال پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس صورت میں دعائے نبی غیر مستجاب ہو جاتی ہے اس لیے کہ جناب یحییٰؑ وارثِ مال نہیں ہوئے چونکہ زکریاؑ کی زندگی میں شہید ہو گئے۔ البتہ وارثِ نبوت ضرور ہوئے اس لیے کہ نبی ہوئے لیکن اس کا حل یہ ہے کہ اعتراض ہر حال میں باقی ہے اگر وراثت نبوت کے قائل ہوں تو بھی دعا غیر مستجاب ہو گی اس لیے کہ دعا اس وراثت کے لیے ہے جو بعد زکریاؑ حاصل ہو اور یہ نبوت یحییٰؑ

حیاتِ زکریاؑ میں تھی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ آیت کی ایسی توضیح کی جائے جس سے یہ اعتراض بالکل ختم ہو جائے اور وہ یہ کہ جملہ "یرثنی ویرث من آل یعقوب" کو دعائے مقدر کا جواب قرار دیا جائے اور مطلوب زکریاؑ صرف فرزند ہو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے فرزند دے۔ اگر فرزند ہوگا تو وہ وارث بھی ہوگا۔ اس جملہ کو ولی کی صفت نہ قرار دیا جائے کہ جس کا مطلب یہ ہے کہ خدایا ایسا فرزند دے جو وارث بھی ہو۔

بنابریں مسئلہ وراثت دعائے زکریا سے جداگانہ ہے۔ یہ صرف زکریاؑ کا اعتقاد ہے کہ اگر لڑکا ہوگا تو وہ وارث بھی ہوگا۔

اعراب کے اعتبار سے دونوں مسائل میں فرق ہوگا۔ اگر جملہ کو صفت قرار دیا جائے تو وہ مرفوع ہوگا "یرثُنی" اور اگر جواب دعائے مقدر قرار دیا جائے تو مجزوم ہوگا "یرثْنی" چنانچہ اس لفظ کی قرأت میں دو وجہیں نقل کی گئی ہیں۔

اگر ہم قرآن میں دوسرے مقام پر دعائے زکریاؑ کو دیکھتے ہیں تو وہاں بھی دعا صرف ذریت طیبہ سے متعلق نظر آتی ہے: "هب لی من لدنك ذرية طيبة"

فہم قرآن کا سب سے بڑا ذریعہ خود قرآن مجید ہے اور ان آیات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زکریاؑ کا مطلوب صرف ذریت طیبہ ہے۔ البتہ کبھی اس کو ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور کبھی دو جملوں میں جیسا کہ آیت سابقہ میں ہے۔ پہلے ولی کی دعا ہے۔ پھر تمنا ہے کہ وہ پسندیدہ بھی ہو۔

بہر حال دونوں مقامات کو ملانے کے بعد یہ حاصل ہوتا ہے کہ وراثت کا مسئلہ حدودِ دعا سے خارج ہے لہٰذا اس کو دعائے مقدر کا جواب ماننا پڑے گا۔

اب یہ امر واضح ہو گیا کہ کلمہ ارث کا استعمال بالکل صحیح ہوا ہے اور مرادِ آیت وراثتِ مال ہے نہ کہ ارثِ نبوت۔ اس لیے کہ حقیقتاً وراثتِ مال ہی وہ شے ہے کہ جو جواب واقع ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ جوابِ دعا وہ شے ہوا کرتی ہے کہ جس کو اصل دعا سے دائمی یا کم از کم اکثری ارتباط ہو اور ظاہر ہے کہ نبوت ایسی شے نہیں ہے۔ دنیا میں لاکھوں اولاد پیدا ہوتی ہے لیکن نبی کوئی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ یہ شے کمالِ عظیم اور جمالِ کامل کی طالب ہے۔ ایسی نبوت کو سوالِ ذریت طیبہ کا جواب نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ ذریتِ انسانی اور قابلِ تحمل گرانیٔ نبوت میں نسبت ایک اور لاکھ کی ہے۔ برخلاف وراثتِ مال کے کہ وہ جوابِ دعا بن سکتی ہے۔ اس لیے کہ لڑکا جب باپ کے بعد باقی رہتا ہے تو اکثر وارث بھی ہوتا ہے۔ اب چونکہ یہ ایک اکثری امر ہے لہٰذا اس کا اعتقاد زکریاؑ کو بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ خود حضرت زکریاؑ بھی نبوت کو لازمۂ ذریت نہیں جانتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اولاد کی دعا کے بعد یہ دعا بھی کی کہ بارِ الٰہا! اس اولاد کو نیک اور پسندیدہ بھی قرار دے۔ ظاہر ہے کہ نبوت کے بعد اس دعا کا کوئی محل باقی نہیں رہتا۔

اگر ہم کلمہ یرثنی کو صفتِ ولی بھی قرار دیں جب بھی ہمارا خیال ہے کہ نتیجہ وہی رہے گا۔ اور مراد وراثتِ مال ہی ہوگی۔ اس سلسلے میں دو باتیں ہماری مؤید ہوں گی :

(۱) —— اگر جنابِ زکریاؑ کا مطلب وہ ولی ہوتا جو وارثِ نبوت بھی ہو تو وہ دعائے پسندیدگی نہ فرماتے۔ اس لیے کہ نبوت پسندیدگی سے کہیں عظیم منزل ہے۔

(۲) —— سورۂ آل عمران میں جنابِ زکریاؑ کے قصہ میں ارث کا مطلق ذکر نہ ہونا یہ بتاتا ہے کہ اگر میراث حدودِ دعا سے خارج نہیں تو کم از کم میراث سے مراد ارثِ مال ضرور ہے۔ اس لیے کہ اگر زکریاؑ کی دعائیں دو ہوتیں، ایک پسندیدہ ولی کی اور دوسری وراثتِ نبوت کی تو قرآن مجید، آل عمران میں صرف ایک دعا پر اکتفا نہ کرتا۔

اگر اس امر کی وضاحت درکار ہے تو یوں تصور فرمائیں کہ اگر کوئی سائل آپ سے ایک باغ اور ایک درہم طلب کرے اور آپ دونوں اسے دے دیں اور پھر قصہ کو نقل کریں اور اپنے فضل وکرم کا اظہار کریں تو کیا ممکن ہے کہ ایک درہم کا ذکر کریں اور باغ کا ذکر چھوڑ دیں۔ حاشا وکلّا ! ہمیشہ بڑی شے کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جب عام اعلانات واحسانات کا یہ قانون ہے تو عطاءِ نبوت جو کہ باغ دنیوی سے لاکھوں درجہ اہم ہے، کیا ممکن ہے کہ ذریت کے مقابلے میں اس کا ذکر بالکل ترک کر دیا جائے ؟

ان وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد وراثت مال ہے۔ اس لیے کہ یہ ذریتِ طیبہ سے پست ہے۔ اب اگر اس کا تذکرہ کسی مقام پر بھی نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

(۶) ——— بعض علماء نے آیت میں میراث نبوت مراد لینے کی دو وجوہات تحریر فرمائی ہیں:

(۱) ——— جناب زکریاؑ نے اپنی وراثت کے ساتھ آلِ یعقوبؑ کی وراثت کا بھی ذکر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰؑ تمام اموالِ آلِ یعقوبؑ کے وارث نہیں تھے۔ البتہ نبوت وحکمت کے وارث ضرور تھے۔

(۲) ——— جناب زکریاؑ نے بطور تمہید کہا تھا "خدایا! مجھے اپنے بعد کے لیے اپنے ابناءِ عم سے خطرہ ہے" اور ظاہر ہے نبی کو خطرہ احکامِ دین اور آثارِ شرعِ متین کے بارے میں ہوگا۔ جس کی بقا مطلوبِ رسالت ہے نہ کہ اموالِ دنیوی کا کہ جو مقامِ نبوت سے کہیں زیادہ پست ہے۔

ہمارے علماء نے پہلی دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ جناب زکریاؑ نے تمام آلِ یعقوبؑ کی وراثت کی دعا نہیں کی، بلکہ بعض کی۔ جیسا کہ آیت میں مذکور ہے: "ویرث من آل یعقوب"[1] اور یہ دعا قبول بھی ہوگئی۔ لہٰذا یہ اعتراض لغو ہے۔

رہ گئی دوسری دلیل تو وہ ہمارے مطلوب کی شاہد ہے۔ اس لیے کہ نبوت کے بارے میں خطرہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ جبکہ یہ طے شدہ امر ہے کہ لطفِ خداوندی انسان کو بلا کسی حجت و دلیل کے حیران و سرگرداں نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی نبی بناتا رہے گا اور ہر عہد میں صاحبِ استحقاق کو یہ عہدہ دیتا رہے گا۔ اس کے لٹنے اور برباد ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

تو پھر کیا دعائے زکریاؑ کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یہ احتمال دیا تھا کہ اللہ

---

[1] کلامِ عرب میں لفظ "مِن" بعض کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہوں کتبِ علمِ نحو (مترجم)

ابناءعم میں سے ان لوگوں کو منصب دے دیگا کہ جو واجباتِ رسالت اور فرائضِ نبوت کو نہ ادا کرسکیں۔ یا یہ خیال تھا کہ میری دعا کے بغیر اللہ بندوں کو بلاحجت ودلیل چھوڑ دے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں شانِ نبوت سے بعید ہیں۔

بنابراین مراد صرف خوف اموال ہے۔ اس لیے انھوں نے "ولیاً رضیاً" کا مطالبہ کیا تھا۔ اور اس دعا میں نبی کے لیے کوئی نقص نہیں ہے اس لیے کہ ممکن ہے ان کا مطلوب یہ رہا ہو کہ یہ مال اچھی اولاد کو ملے تاکہ مصرف اچھا ہو، ورنہ اگر ابناءِ عم کو مل گیا تو وہ لہو ولعب، فتنہ وفساد میں صرف کردیں گے، جیسا کہ آثار سے انھوں نے اندازہ کرلیا تھا۔ یہاں تک کہ مشہور ہے کہ جناب زکریاؑ کے ابناءِ عم اشرارِ بنی اسرائیل تھے۔

ابن ابی الحدید معتزلی نے کوشش کی ہے کہ جناب زکریاؑ کے خوف کو آثارِ دین سے متعلق قرار دیں اور اس پر دو قسم کی دلیلیں قائم کی ہیں۔

(۱) ——— یہ دعویٰ کرنا کہ آثارِ دین کا خوف کرنا نبی کے لیے ناجائز ہے اصولِ شیعہ کی بنا پر قطعی غلط ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ قائل ہیں کہ ہم غیبتِ امام کی بنا پر اکثر الطافِ الٰہیہ سے محروم ہوگئے ہیں جیسے نمازِ عید، جمعہ وغیرہ اور اس کا مظلمہ ہماری ہی گردن پر ہے۔ اس لیے کہ ہماری بدکرداریاں ہی اس کا سبب ہوئی ہیں۔ تو کیا ایسی قوم کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ جناب زکریاؑ کے لیے بھی یہ تصور کرے کہ وہ تبدیلیٔ دین اور بربادیٔ احکامِ شریعت سے خائف رہے ہوں گے اس لیے کہ اللہ پر بعثتِ رسول واجب ہے، اگر لوگ خود فساد برپا کریں اور دین میں تبدیلی لائیں تو خدا پر واجب نہیں کہ ان کے درمیان دین کو محفوظ رکھے۔ کیونکہ انھوں نے خود لطفِ الٰہی

کو مسترد کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ابنائے عم کے فساد سے سد بابِ لطف
کا احتمال تھا اس لیے جنابِ زکریاؑ کو بھی خوف پیدا ہوا۔

ہمارا اعتراض اس کلام پر صرف یہ ہے کہ

اس مقام پر ابن ابی الحدید نے دو مطالب کو باہم مخلوط کر دیا ہے
ایک وہ موقع ہوتا ہے کہ جب لوگ اس طرح نااہل ہو جائیں کہ لطفِ الٰہی کا استحقاق ختم
ہو جائے جیسا کہ زمانِ غیبتِ امام میں ہے۔ اس صورت میں خوف پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک
موقع وہ ہوتا ہے کہ جہاں انسان یہ جانتا ہے کہ ایک جماعت منصبِ الٰہیہ کے حصول کی
لیاقت نہیں رکھتی، حالانکہ لوگ لطف و کرمِ الٰہی کے مستحق ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں بعثتِ رسول، خداوندِ عالم پر واجب
ہے لہٰذا اب خوف کا کوئی محل نہیں رہتا۔ بنا بر ایں ابناءِ عم کا نااہل ہونا اس امر کا باعث نہیں
ہو سکتا کہ زکریاؑ کو انقطاعِ سلسلۂ نبوت کا خوف پیدا ہو جائے۔ جبکہ لوگ بھی الطافِ الٰہیہ
کے مستحق ہیں۔ ہاں اگر لوگ مستحقِ لطف نہ رہیں تو ممکن ہے کہ زمین و آسمان کے اتصالی سلسلے
قطع ہو جائیں، خواہ اولاد و ابناءِ عم صالح ہوں یا فاسد۔ ذرّیت طیّب ہو یا غیر طیّب،
آیت صراحتاً دلالت کرتی ہے کہ زکریاؑ کا خوف ابناءِ عم کی خرابی سے تھا نہ کہ لوگوں کی نااہلی
سے۔ بنا بر ایں خوف انقطاعِ نبوت سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خوف
بربادیٔ اموال سے متعلق تھا۔

(۲) ———— ہم موالی کے معنی امراء و رؤسا کے قرار دیں گے اور مقصد یہ ہوگا کہ
جناب خائف تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ امراء و رؤسا مسلط ہو کر
دین کو فاسد کر دیں۔ اسی لیے دعا کی کہ اللہ ایک نبی بنا دے تاکہ
دین محفوظ رہ سکے۔

ہم سوال کریں گے کہ یہ رؤسا کہ جن سے دین میں خطرہ تھا یہ انبیاء تھے یا غیر انبیاء؟

ظاہر ہے کہ انبیاء سے دین کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں۔ البتہ ملوکِ دنیا سے کبھی کبھی دین کو خطرہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اس وقت ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ وجودِ نبی آیا ان کے شر و فساد اور توہینِ دستورِ الٰہی کو روک سکتا ہے یا نہیں۔ اگر وجودِ نبی ان کے دفاع کے لیے کافی ہے تو زکریاؑ کو خوف کی کیا ضرورت ہے؟ جب کہ وہ جانتے ہیں کہ الطافِ الٰہیہ بعثتِ نبی کے قیامت تک کے لیے ضامن ہیں اور یہ اتصالِ زمین و آسمان تا بقائے دنیا باقی رہے گا۔

اور اگر وجودِ نبی دفاعِ اشرار کے لیے کافی نہیں ہے تو زکریاؑ کی دعا بے سود ہے۔ اس لیے کہ اولاد کا وجود بھی ان کے خوف کو زائل نہیں کر سکتا۔ حالانکہ ظاہرِ آیت یہ ہے کہ مطلوب نظر وارث کے ملنے کے بعد ان کا خوف دور ہو جائے گا۔

اس قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرادِ قرآن ارثِ مال ہے نہ کہ ترکۂ نبوت۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ انبیاء میں سلسلۂ توارث ہے تو اب خلیفہ کی حدیث قرآن سے معارض ہو گئی اور ہر وہ شے جو قرآن سے معارض ہو وہ ساقط اور باطل ہے۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمام انبیاء میں سے زکریاؑ کو مستثنیٰ کر دیں اس لیے کہ حدیثِ خلیفہ قابلِ تخصیص[1] نہیں ہے۔ لہٰذا اگر نبوت عدمِ توارث کی مقتضی ہے تو ہر نبی

---

[1] اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بعض روایات اس قسم کی ہوتی ہیں کہ ان میں تخصیص غیر ممکن ہوتی ہے اگرچہ اس کا کوئی قانونِ کلی مقرر نہیں ہے لیکن روایت کے الفاظ خود اپنی حیثیت کو واضح کر دیتے ہیں جیسے کہ معصوم کا یہ ارشاد کہ کتابِ خدا سے معارض حدیث باطل اور قابلِ عمل نہیں ہے۔ اب اگر کسی راوی کی معارض حدیث کو مستثنیٰ کرنا چاہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ باطل حدیث پر بھی بعض حالات میں عمل ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ امر خود باطل ہے۔ بعینہٖ یہی معاملہ اس مقام پر ہے اس لیے کہ حدیثِ خلیفہ میں انبیاء کی عظمت کی بنا پر وراثت کی نفی کی گئی ہے اب اگر کسی نبی کے یہاں وراثت کے قائل ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی عظمت سے انکار کر دیں اور یہ محال ہے

کی شان یہی ہونی چاہیئے۔ نبوتِ زکریاؑ میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں ہے کہ وہاں توارث ہو اور باقی کے یہاں نہ ہو۔ آخر زکریاؑ کا کیا قصور ہے کہ ان کا مال امّت کو نہ ملے اولاد لے جائے؟ یا ان کا کیا امتیاز ہے کہ ان کا مال تو اولاد کو ملے اور باقی کا مال لوگ لوٹ کھائیں؟

اس کے علاوہ حدیثِ خلیفہ میں لفظ انبیاء میں کوئی تخصیص کی ضرورت بھی نہیں ہے جب کہ ہم نے اس کے ایسے مناسب معنی بیان کر دیے کہ جو قرآن سے قطعاً معارض نہیں ہیں۔ اب ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم ایسے معنی قرار دیں کہ جس کی وجہ سے زکریاؑ کو فہرستِ انبیاء سے خارج کرنا پڑے۔

اب واضح ہو گیا کہ خلیفہ کے مفہوم کی بنا پر روایت آیت سے بالکل معارض ہے لہٰذا اسے ترک کرنا واجب ہوگا اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب صدیقۂ طاہرہؑ نے آیت مذکورہ سے خلیفہ پر اعتراض کیا تو انھیں کوئی جواب بن نہ پڑا اور نہ آج تک ان کے ماننے والوں نے اس کا کوئی جواب دیا۔ جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جانتے ہیں کہ آیت سے روایت کا تعارض ہو رہا ہے اور روایت کسی صورت سے قابل عمل نہیں ہو سکتی۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ علی القاعدہ جب دو دلیلوں میں تعارض ہو تو ایک کو مقدم کر سکتے ہیں۔ اور خلیفہ نے حدیث کو مقدم کر دیا اور کیوں کہ قرآن سے متعارض حدیث باطل و خرافات ہے اس لیے اسے دلیل ہی نہیں کہتے۔

خلیفہ کی جرح دوسرے مرکز پر

(مقامِ ثانی۔ موقفِ خلیفہ در موضوعِ عطیہ):

صدیقۂ طاہرہؑ مدعی ہیں کہ رسولؐ نے انھیں فدک عطیہ کر دیا تھا اور اس کے شاہد ام ایمن، علی ابن ابی طالبؑ اور حسنینؑ ہیں۔ خلیفہ نے دعویٰ کو قبول نہیں کیا اور بیّنہ کاملہ یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورت کا مطالبہ کیا۔

✵ —— سب سے پہلا مواخذہ صدیق سے یہ ہوگا کہ وہ اس مسئلہ میں حاکم کیونکر بن گئے۔ حالانکہ کم از کم اس وقت تک ان کی حکومت شرعی نہ تھی۔ ہم فی الحال اس مواخذہ کو ترک کیے دیتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ موضوع انتہائی وسیع ہے جس کے نتیجہ میں اسلامی سیاست کا سنگ بنیاد ہی اکھڑ جائے گا اور اس کام کے لیے حساب طویل درکار ہے۔

✵ —— دوسرا مواخذہ یہ ہے کہ جب فدک فاطمہؑ کے قبضہ میں تھا تو اب انھیں گواہ پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس مقام پر دو بحثیں ہیں:

(۱) —— فدک کس کے قبضہ میں تھا؟ کیا فدک واقعاً فاطمہؑ کے ہاتھ میں تھا؟

اس مطلب کا بہترین ثبوت امیرالمومنینؑ کا وہ خط ہے جو آپ نے عثمان بن حنیف کے نام تحریر فرمایا تھا:

"ہاں! فدک ہمارے ہاتھ میں تھا۔ اس کے بعد ایک قوم نے اس کی طمع کی اور دوسری نے ان کو دے دیا۔"

اس کلمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فدک اہلبیتؑ کے ہاتھ میں تھا جیسا کہ روایاتِ شیعہ میں بھی ہے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ "ہمارے ہاتھ میں فدک تھا" اس سے واضح ہوتا ہے کہ مراد صرف علیؑ و فاطمہؑ کا ہاتھ ہے نہ کہ دستِ پیغمبرؐ۔ اس لیے کہ پیغمبرؐ کے ہاتھ میں غیر فدک اور اموال بھی تھے اور آپ نے فرمایا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں فدک تھا۔

(۲) —— کیا قبضہ دلیل ملکیت ہے؟ اس کا ثبوت اجماعِ مسلمین ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو نظامِ اجتماعی حیاتِ انسانی مختل ہو کر رہ جاتا۔

بعض لوگ اس دعوی پر کہ فدک فاطمہؑ کے قبضہ میں تھا یہ اعتراض کرتے

ہیں کہ اگر ایسا ہوتا تو آپ ذکر کرتیں اور اس وقت نہ دعویٰ عطیہ کی ضرورت پڑتی اور نہ میراث کی۔

کتب شیعہ میں اس کا جواب موجود ہے کہ اہل بیتؑ نے اس بات سے بھی استدلال کیا ہے۔ لیکن ہم ان کتابوں سے بحث کرنا نہیں چاہتے بلکہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فدک کوئی معمولی زمین یا چھوٹی ملکیت نہیں کہ جس کا قبضہ ادنیٰ توجہ سے معلوم ہو جائے بلکہ یہ ایک وسیع اراضی ہے جس میں فاطمہؑ کا وکیل انتظام کرتا تھا۔ تو اب بتلایئے کہ اس کے قبضہ کا علم غیر وکیل کو کیا ہو سکتا ہے؟

یہ بھی معلوم ہے کہ فدک مدینہ سے قریب بھی نہ تھا کہ اہل مدینہ کو اس کے حالات کا علم ہو جائے اور وہ یہ جان لیں کہ اس کا متولی کون ہے۔ بلکہ مدینہ سے چند دنوں کے راستے پر تھا اور ایک یہودی قریہ تھا جس کو محیط اسلامی سے کوئی تعلق بھی نہ تھا بنا بریں قبضہ کا مشہور نہ ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔

عجب نہیں کہ صدیقہ نے خیال کیا ہو کہ اگر میں نے دعویٰ قبضہ کیا تو خلیفہ اس پر بھی بینہ گواہ طلب کرے گا جس طرح کہ عطیہ کے دعویٰ پر طلب کیا ہے۔ جبکہ خلیفہ کی رفتار صدیقہ کی نظر میں ایسی غیر منصفانہ ہے جو کسی حق کے اعتراف پر راضی نہیں۔

اس زمانہ میں تو یہ بھی آسان تھا کہ وکیل فاطمہؑ کو کوئی مچھلی نگل جاتی جیسے کہ ابو سعید خدری کو نگل گئی اور انھوں نے حدیث عطیہ کو نہیں بیان کیا اور واقعہ کے چند دنوں بعد اسے ظاہر کر دیا۔ یا کوئی جن قتل کر دیتا جس طرح کہ سعد بن عبادہ کو قتل کر کے اس نے فاروق کو نجات دلادی۔ یا پھر ارتداد ہی سے متہم کر دیا جاتا یہ کہہ کر کہ یہ صدقہ مسلمین کو روکتا ہے جیسا کہ مانعین زکوٰۃ کو متہم کیا گیا۔

(۳) ———— ہم اس اعتراض کو بھی ترک کیے دیتے ہیں تاکہ ایک بنیادی سلسلہ شروع کریں اور وہ یہ کہ خلیفہ کو عصمت زہراؑ کا اعتقاد اور آیۂ تطہیر

جس میں فاطمہؑ شامل ہیں اس پر ایمان تھا یا نہیں ؟

ہم اثباتِ عصمت کے مسئلے کو طول دینا نہیں چاہتے۔ اس سے تو کتبِ امامیہ بھری ہوئی ہیں جن کا خلیفہ کو بھی علم تھا۔ اس لیے کہ عائشہ خود بھی آیۂ تطہیر کی راوی ہیں کہ وہ خمسہ نجباء کی شان میں نازل ہوئی۔ اور اس امر کی تصریح صحاح سنت و شیعہ میں ہے کہ رسول اللہؐ نزولِ آیت کے بعد چھ ماہ تک بعد نمازِ صبح فاطمہؑ کے دروازہ پر آکر اس آیت کی تلاوت فرماتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ خلیفہ نے فاطمہؑ سے گواہ کیوں طلب کیا ؟

کیا یقینی دعویٰ بھی محتاجِ بیّنہ ہوتا ہے ؟

ابوبکر پر بعض معترضین کا کہنا ہے کہ شاید ظنِ غالب کے حصول کے لیے بیّنہ طلب کیا ہے۔ جبکہ ظاہر ہے کہ علم و یقین ظن سے بہتر ہے۔ اگر حاکم کو مدعی کی صداقت کا یقین ہو تو اس کے حق میں فیصلہ دے دینا چاہیے اور پھر بیّنہ طلب کرنا درست نہیں۔

لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اعتراض غیر مناسب ہے۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے بیّنہ اور علم کو نفسِ حاکم میں تاثیر کے اعتبار سے مقابل قرار دیا ہے۔ اس لیے فیصلہ کیا ہے کہ علم اقویٰ ہے۔ حالانکہ اس کا مقابلہ واقعہ کے اعتبار سے ہونا چاہیے اور اس لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ علم بھی خطا کرتا ہے اور بیّنہ بھی۔

البتہ اس مقام پر ایک نکتہ ہے جس سے اکثر حضرات غافل ہو گئے ہیں اور وہ یہ کہ صداقتِ زہراؑ کے متعلق خلیفہ کا علم کبھی خطا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ وہ ان اسباب سے نہیں حاصل ہوا جس میں اکثر وہم و جہل مرکب ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کا مدرک قرآن کریم ہے جس سے خطا غیر ممکن ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ صداقتِ زہراؑ کا علم غلط نہیں ہو سکتا۔ البتہ بیّنہ خطا ہو سکتا ہے اور جب کہ بیّنہ سے حکم واجب ہے تو علم سے تو بہرحال واجب ہوگا۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ اگر آیتِ قرآنی یوں ہوتی کہ فاطمہؑ دعویٔ ملکیتِ فدک وعطیہ میں صادق ہیں تو کسی مسلمان کو مجالِ شک اور کسی اسلامی حاکم کے لیے محلِ تردد باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ تو اسی طرح جب قرآن نے عصمتِ زہراؑ پر نص کر دی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فاطمہؑ کوئی غلط دعویٰ نہ کریں گی۔

اب جو یہ دعویٰ کریں اس کا قبول کرنا واجب ہوگا۔ ان دونوں قسموں کی نص میں کوئی فرق واقعی نہیں ہے، البتہ عبارتی فرق ضرور ہے۔

ہم یوں بھی استدلال کر سکتے ہیں کہ آج تک کسی مسلمان نے صدقِ زہراؑ میں شک نہیں کیا اور نہ کسی نے یہ کہا ہے کہ فاطمہؑ نے اپنے باپ پر افترا کیا ہے۔ صرف نزاع اس بات پر تھی کہ آیا فیصلہ کے لیے علم کافی ہے یا پھر گواہیوں کی ضرورت ہے۔

ہم آیۂ تطہیر کو ترک کیے دیتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ جب کہ خلیفہ کو مثل باقی مسلمانوں کے صدقِ زہراؑ کا علم تھا، اگرچہ اس میں وہ خصوصیات نہ رہی ہوں جنھیں ہم نے بیان کیا اور وہ بھی قابلِ خطا و اشتباہ رہی ہوں اور اس اعتبار سے بیّنہ سے بہتر یا اس کے مساوی نہ رہی ہوں لیکن کیا حاکم کو اپنے علم کی بنا پر حکم کرنے سے کوئی شے مانع ہے؟ حاکم کے لیے جس طرح جائز ہے کہ اپنے علم کی بنا پر فیصلہ کرے اسی طرح اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ گواہوں کی بنیاد پر فیصلہ کرے۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ حاکم اپنے علم کی بنا پر حکم کر سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

" وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ
تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ " (سورۂ نساء ۴۔ آیت ۵۸)

" وَمِمَّنْ خَلَقْنَا اُمَّةٌ يَهْدُوْنَ بِالْحَقِّ
وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ " (سورۂ اعراف، آیت ۱۸۱)

حق و عدل کے دو لحاظ ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ کبھی بات واقعی اعتبار سے حق

ہوتی ہے خواہ اس کے لیے گواہ نہ ہوں اور کبھی قانونی اعتبار سے حق ہوتی ہے خواہ واقعاً گواہوں نے غلط بیانی سے کام لیا۔ اب اس آیت سے مراد اگر پہلے معنی ہیں تو خلیفہ کا فرض تھا کہ وہ حق کو جانتے ہوئے حکم کر دیتے، چاہے کوئی گواہ ہوتا یا نہ ہوتا۔

اور اگر دوسرے معنی مراد ہیں تو انھیں تردد کا حق حاصل ہے۔

قانونِ ادب یہ کہتا ہے کہ آیت سے مراد پہلے معنی ہیں۔ اس لیے کہ ہر لفظ سے اسکے اصلی معنی مراد ہوتے ہیں نہ کہ قانونی۔ جیسا کہ دنیا کی ہر زبان میں واضح ہے۔

مثلاً لغت میں مالک اسے کہیں گے کہ جس کے پاس کوئی ملک ہو، چاہے قانون تسلیم کرے یا نہ کرے، اسے نہیں کہیں گے کہ جسے قانون نے مان لیا ہے چاہے واقعاً مالک ہو یا نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ اگر یہ لفظ قانون کے رجسٹر میں درج ہو تو وہاں قانونی ہی معنی مراد ہوں گے۔ لیکن یہ بات لغت سے خارج ہے اور اسے اصطلاح کہتے ہیں۔

یہ بھی واضح ہے کہ واقعی حق دعوتِ عمل کا محتاج ہے۔ اس لیے کہ واقعہ اور ہوتا ہے اور قانون اور۔ لیکن قانونی حق کے لیے الگ سے دعوت دینا لغو ہے۔ وہاں تو قانون وضع کر دینا خود ہی دعوتِ عمل ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ آیات اعتبارِ علمِ حاکم پر بخوبی دلالت کرتی ہیں اور اس کے بعد خلیفہ کو کسی تردد و تامل کا حق نہیں ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ صدیق نے فقط دعویٰ پر اعتماد کر کے حکم کیا ہے جیسا کہ بخاری میں ہے کہ

> بعد وفاتِ پیغمبرؐ اکرم، علاء بن حضرمی نے ابوبکر کے پاس کچھ مال بھیجا، وہ بولے کہ جس کا نبیؐ پر کوئی قرض ہو یا جس سے انھوں نے کوئی وعدہ کیا ہو وہ آکر لے جائے۔ جابر نے کہا مجھ

سے رسول ؐ نے حسب ذیل وعدے فرمائے ہیں۔ ابوبکر نے تین مٹھیاں دیں جن میں ہر ایک میں پانچ سو درہم تھے۔

طبقات ابن سعد میں ابو سعید خدری سے روایت ہے وہ کہتے ہیں :

" میں نے مدینہ میں ابو بکر کی منادی سنی ، اس وقت جب کہ مال بحرین آیا۔ جس کا رسول ؐ سے کوئی وعدہ رہا ہو وہ آئے۔ بہت سے لوگ آئے اور لے گئے ، اتنے میں ابوالبشیر مازنی آگئے۔ ابوبکر نے کہا : اے ابوالبشیر! جب کوئی مال آیا کرے تو تم بھی آیا کرو اور یہ کہہ کر ایک ہزار چار سو درہم دیے۔"

اب جب کہ خلیفہ نے کسی صحابی سے قرض یا وعدۂ رسول ؐ پر بیّنہ (گواہ) نہیں مانگا تو فاطمہ ؑ سے دعویٔ عطیہ پر بیّنہ کا مطالبہ کیوں کیا ؟

کیا نظامِ قضاوت صرف فاطمہ ؑ سے مخصوص تھا ؟

یا حالاتِ سیاسیہ نے فاطمہ ؑ کو یہ خصوصیت عطا کر دی تھی ؟

عجیب بات ہے کہ صحابیٔ رسول ؐ کے دعویٰ کو مالِ کثیر میں قبول کر لیا جائے ، اور بضعۃ الرسول ؐ کا دعویٰ یہ کہہ کر ٹھکرا دیا جائے کہ گواہ موجود نہیں ہے۔

اگر صداقتِ مدعی کا علم فیصلہ کو جائز بنا دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ جس کی نظر میں جابر و ابوالبشیر متہم نہیں اس کی نظر میں فاطمہ زہرا ؑ بھی متہم نہیں ہو سکتیں اگر صحابہ کے عطایا دعویٰ کی قبولیت کی بنا پر نہ تھے بلکہ احتمالِ صدق کی بنا پر احتیاطاً دیے گئے تھے تو پھر فدک کے معاملہ میں احتیاط کیوں نہیں کی گئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ

ابوبکر کے اس طرزِ عمل سے وعدہ اور عطیہ کا فرق قیامت تک کے لیے تشنۂ جواب رہ گیا کہ وعدہ میں تو گواہ کی ضرورت نہ ہو اور عطیہ کے لیے معصوم گواہوں

کی گواہی بھی معتبر نہ ٹھہرے۔

❋ ——— اب ہم اپنے اعتراض کو ایک نئی بنیاد پر قائم کرتے ہیں اور وہ یوں کہ ہم اس بات کو تسلیم کیے لیتے ہیں کہ حاکم کو اپنے علم کی بنا پر بغیر گواہ کے حکم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صدیق نے خود دعویٰ عطیہ کی گواہی کیوں نہیں دی؟ جبکہ انھیں صداقتِ زہراؑ کا علم تھا۔ اگر وہ اپنی گواہی کو علیؑ کی گواہی کے ساتھ ملا دیتے تو نصاب کامل ہو جاتا اور حق ثابت ہو جاتا۔

یہ بھی واضح رہے کہ ان کا حاکم بن جانا ان کی گواہی کو ساقط نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اعتبارِ بیّنہ کی دلیلیں غیر حاکم کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ انھیں ہر ایک کے لیے عمومیت حاصل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خلیفہ نے واقعہ معلوم کو کیوں ترک کیا؟

اس امر کی وضاحت کے لیے ہم دو باتوں کا فرق واضح کر دینا چاہتے ہیں جن کو اکثر علماء نے مخلوط کر دیا ہے[۱]

(۱) ——— مدعی کے قول کے مطابق حکم کرنا۔

(۲) ——— واقعی آثار کا نافذ کرنا۔

اگر ہم تسلیم کر لیں کہ پہلا امر گواہی پر موقوف ہے تو دوسرا تو بہر حال واجب ہے اس لیے کہ یہ کوئی حکم یا قانون نہیں ہے کہ اس کے حدود و قیود مقرر کیے جائیں۔ مثلاً اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ میرا مکان دوسرے کا ہے تو مکان اسے دے دینا حکم نہیں کہا جاتا بلکہ اسے واقعی قانون پر عمل کہا جاتا ہے۔ جس طرح سے اگر کوئی شخص خود

---

[۱] اس مسئلہ کی ایک واضح مثال رویتِ ہلال ہے، اس لیے کہ کبھی حاکم شرعِ رویت کا حکم کرتا ہے تو پہلے تو اس کے لیے قانونی ثبوت کی ضرورت ہے تو پھر اس کی مخالفت ناجائز ہے لیکن کبھی یہ کہتا ہے کہ میری نظر

(باقی اگلے صفحہ پر)

حاکم پر کوئی دعویٰ کرے یا کسی طرح ثابت کردے کہ تمھارا مکان میرا ہے تو حاکم کو اسے دے دینا چاہیے اور یہ قضاوت نہیں ہے بلکہ یہ بات بلا حاکم و حکم کے بھی ثابت ہے۔ اس لیے کہ قبضہ وغیرہ دلیل قضاوت نہیں ہیں۔ بلکہ آثار ملکیت میں ہیں۔ اور آثار واقعی کو پیش نظر رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

اگر حاکم کسی شخص کے لیے کسی مکان کی ملکیت کا حکم کرے یا یہ کہ مکان پر آثار ملکیت مرتب کرے تو ان دونوں باتوں کا فرق یہ ہوگا کہ قضاوت قطع نزاع ہے اگر حاکم نے کوئی فیصلہ کر دیا تو اب تمام مسلمانوں کے لیے اس کا نقض کرنا حرام ہے اور سب پر اس کے آثار مرتب کرنا واجب ہے جس کی دلیل صرف حکم حاکم ہے۔ اور کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔ برخلاف "تطبیق آثار ملکیت" اس لیے کہ یہ قاضی کا شخصی فعل ہے اس کا اتباع لازم نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے علم کے مطابق اس شے سے معاملہ کرے گا۔

نتیجہ کلام یہ ہے کہ

جب خلیفہ کو فاطمہؑ کی ملکیت کا علم تھا تو انھیں فدک میں کسی قسم کے تصرف کا حق نہ تھا۔ خواہ حکم کرنا ان کے لیے جائز ہو یا نہ ہو۔ پھر جب کہ اس واقعہ میں ان کے علاوہ کوئی اور منکر بھی نہیں تھا کہ جس سے قسم لے کر اسے مال دے دیا جاتا۔ اس لیے کہ جن اموال کی فاطمہؑ مدعی تھیں یا تو وہ مال ان کا تھا یا مسلمانوں کا۔ اور فرض یہ ہے کہ ابوبکر خلیفۂ مسلمین تھے، لہٰذا یہ ولی مسلمین بھی تھے۔ اور ان کا فرض تھا کہ ان کے حقوق کا تحفظ کرتے۔

(گزشتہ سے پیوستہ :-)

میں رویت ثابت ہے تو ایسے وقت خود کے لیے عمل واجب ہے۔ اگرچہ دوسروں پر کوئی قانون نافذ نہیں کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ قانون سے یہ ثابت ہونا اور ہے اور اپنے علم پر عمل کرنا اور۔ (مترجم)

اگر فاطمہؑ اپنے دعویٰ میں سچی تھیں اور مسلمانوں میں ان کا کوئی مخالف نہیں تھا تو ان سے سلب وغصب کرنا ناجائز تھا۔ گواہ کا نہ ہونا فیصلہ کو حرام بناتا ہے نہ کہ غصب کو جائز و حلال۔

خلاصہ یہ ہوا کہ

اپنے ذاتی علم کی بنا پر حکم نہ کر سکنا خلیفہ کے محاسبہ کو خفیف نہیں بنا سکتا۔ اس لیے کہ معاملہ دو غیر آدمیوں کے درمیان نہیں تھا کہ بغیر گواہ کے حکم نہ ہوتا بلکہ وہ مال پر خود ہی قابض تھے لہٰذا ان کا فریضہ تھا کہ اپنے علم کی بنا پر مال فاطمہؑ زہرا کے حوالے کر دیتے اور خود غصب کی عقوبت سے محفوظ ہو جاتے۔ ایسی صورت حال میں تو تضادوت اور فیصلہ کی بھی ضرورت نہ تھی کہ جہاں گواہ و بینہ تلاش کیا جاتا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

فہرست